نہیں۔۔یں۔۔یں

(افسانے)

منزّہ سلیم

نہیں۔۔یں۔۔یں
(افسانے)
منزّہ سلیم

مثال

منزّہ سلیم ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں زرعی یونیورسٹی لائل پور سے رورل سوشیالوجی میں ایم۔ایس۔سی کی۔ زمانۂ طالبِ علمی میں یونیورسٹی کے مجلّہ کشتِ نو کے اُردو حصہ کی ایڈیٹر رہیں۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی سے بہترین نثر نگار کا انعام حاصل کیا۔ انھیں حلقہ اربابِ ذوق لائل پور کی پہلی خاتون رُکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حلقہ کی مختلف نشستوں میں افسانے اور مزاحیہ مضامین پڑھتی رہیں۔

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین فیصل آباد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ہیڈ آف سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے طور پر کام کرتی رہی ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' منظرِ عام پر آئی جسے ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور تعلیمی بورڈ سے انعام کی حق دار ٹھہری۔

۲۰۱۰ء میں ان کے ناول 'ادھوری عورت' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اسے بھی تعلیمی بورڈ سے انعامِ اوّل حاصل ہوا۔

۲۰۱۱ء میں ان کی تیسری کتاب 'میرا قبلہ تے کعبہ' شائع ہوئی جو انھوں نے اپنے مرحوم منجھلے بھائی ڈاکٹر مقبول اختر کی یاد میں تحریر کی ہے۔ 'میرا قبلہ تے کعبہ' دو والیم پر مشتمل ہے پہلے والیم میں مصنفہ اور ڈاکٹر صاحب کے احباب کے مضامین شامل ہیں اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب کے اُردو، پنجابی اور انگریزی مضامین شامل ہیں۔

۔ادارہ

زیرِ تصنیف

۱۔ دراوڑ تہذیب (تاریخ و تحقیق)

۲۔ پرورشِ لوح و قلم (فکاہیہ مضامین)

منزّہ سلیم کی تخلیقی شخصیت کی تشکیل میں خانگی اور خاندانی عوامل کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں ان کی بصیرت اور شگفتگی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردانہ سماج میں تشدد سے مماثل ، ناانصافی پر قائم عائلی زندگی کے بارے میں تلخ صورت حال کا سامنا کرنے والے ان کے نسوانی کردار اپنی انا کی حفاظت وقار کے ساتھ کرتے ہیں، 'نہیں۔۔۔یں۔۔۔یں' کے بیانیہ میں انسانی اقدار کی پاس داری، جمالیاتی احساس کی نزاکت اور ترقی پسندی کی لو، اسے تخلیقی نگار خانہ بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

نہیں---ہیں---ہیں---

(افسانے)

منزّہ سلیم

فرخ منظور صاحب کیلئے

منزّہ سلیم

اگست ۲۰۱۶

نہیں---یں---یں---

(افسانے)

منزّہ سلیم

مثال پبلشرز

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت : 2011ء

کتاب : نہیں---یں---یں--- (افسانے)

مصنفہ : منزہ سلیم

ناشر : محمد عابد

سرورق : اصبح عاصم

قیمت : 250 روپے

تزئین : عبدالحفیظ

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

Nahein.....yein.....yein.....

by

Munazza Saleem

Edition - 2011

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد

Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284

E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

Cell: 0300-7980300

E-mail:misalkitabghar@gmail.com

انتساب

تین بھائیوں میں

سب سے بڑے بھائی **رشید اصغر**

اور

سب سے چھوٹے بھائی **مسعود صفدر**

کے نام

کہ جن کے بغیر بتائے ہوئے تیس برس

میرے لیے تیس صدیوں کی تھکا دینے والی مسافت پر بھاری ہیں

؎ اگر خواہی بگوتا آستیں از دیدہ بردارم

کہ مژگانِ مرا از گریہ شاخ ارغواں بینی

ع 'ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے'

(غالبؔ)

ترتیب

صورتِ احوال آنکہ۔۔۔

کہانیاں۔۔۔ کہانیاں۔۔۔ کہانیاں۔۔۔ رنگارنگ کہانیاں۔۔۔ بے رنگ کہانیاں۔۔۔ بکھری ہوئی۔۔۔ سمٹی ہوئی۔۔۔ ظاہر۔۔۔ چُھپی ہوئی۔۔۔ یا چُھپائی ہوئی۔۔۔ دُنیاان سے بھری پڑی ہے۔ایک ناول یا افسانہ لکھ کر مصنف انھی میں سے ایک کو صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہے لیکن خدا کہ بہت بڑا فنکار ہے دُنیا کے اربوں باسیوں کی اربوں کہانیوں کا خالق ہے۔اگران میں کوئی مماثلت ہے تو بس ایسی، جیسی اِس لطیفے میں نظر آتی ہے۔

ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا:

''تم ظہیر کے بھائی ہو؟

دوسرے نے جواب دیا

''نہیں۔''

''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم ظہیر کے بھائی ہو۔''

''نہیں بھئی میں اس کا بھائی نہیں ہوں۔''

''تم مانتے کیوں نہیں؟ مجھے یقین ہے کہ تم ظہیر ہی کے بھائی ہو۔''

وہ شخص تنگ آ گیا اور چلایا۔

''ہاں ۔۔۔ہاں میں ظہیر کا بھائی ہوں۔''

پہلے آدمی نے بڑے رسان سے کہا۔

''اچھا؟؟؟'' کہتے ہو تو مان لیتا ہوں ۔۔۔ویسے لگتے تو نہیں ہو۔''

میری ماں مجھے کہانی سناتیں تو آخر میں کہتیں:

'اپنی میری بات تے اُتوں پئی رات

چھتنا سی کوٹھا تے چھت لئی سوات

ڈاہنی سی منجی تے ڈاہ لئی چوگاٹھ'

رنگارنگ اور بے رنگ کہانیوں میں سے چند حاضرِ خدمت ہیں لیکن یہ معلوم نہیں

کہ یہ 'منجی' ہیں یا 'چوگاٹھ' ۔۔۔؟

منزّہ سلیم

میری ڈولی شوہ دریا

''وے قدیریا ۔۔۔نہ بکڑواہ کیا کر۔ ربّ کسے ویلے کی کہی ہوئی سن لیتا ہے۔''

بے بے چنگھاڑی۔

''تو بے بے، میں بھی تو ربّ کو سنانے کے لیے ہی کہتا ہوں ۔۔۔ مجھے دِھی چاہیے

ربا ۔۔۔ پر بے بے اس کا نام کیا رکھیں گے؟'' قدیرے نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

بے بے نے ''وگانوی'' جوتی پھینکی جو قدیرے کی پُشت پر لگی تو وہ ڈھیٹوں کی
طرح دانت نکالتا ہوا بھاگا اور شیفی سے ٹکراتا ہوا بال بال بچا، پھر موقعہ غنیمت جانتے ہوئے
اسے آنکھ ماری اور سرگوشی کی۔

''میری گل یاد رکھیں۔''

قدیرے نے پہلی رات کو ہی شیفی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھیں ۔۔۔میری مِنت ہے مجھے دِھی چاہیے۔''

شیفی شرمائی لجائی بیٹھی رہی۔ منہ سے تو کیا کہنا تھا دِل ہی دِل میں ہنسی۔

''اسے کہتے ہیں 'پنڈ بجّھا نہ تے اُچکّے پہلاں ای تیار، کہہ تو ایسے رہا ہے جیسے میں
پیچھے سے لے کر آئی ہوں ۔۔۔ ہے بے عقلا۔''

اور پھر دوسرے ہی مہینے جب شیفی سویرے سویرے اُبکائیاں لے رہی تھی تو قدیرا،
بابے رلیے کے مزار پر پانچ روپے کی نیاز چڑھا کر آیا اور رات کو بے بے سے چوری چوری
گڑوی میں سے دیسی گھی لے کر چراغ بھی جلا آیا۔

باقی کے نو مہینے، بے بے کے ساتھ قدیرے کی تکرار میں ہی گزرے۔ دونوں
روزانہ ایک ہی بات پر جھگڑتے۔

"بے بے پھر نام کیا سوچا ہے؟"

"محمد سلامت علی" بے بے چبا چبا کر کہتی

"اور اگر سلامتی آ گئی تو پھر رر۔۔۔"

قدیرا سر ہلاتا اور آنکھیں مٹکاتا۔

"تو باز نہیں آئے گا۔ آ گئی تو میں نے ڈک تو نہیں لینی۔ ربّ کی دین ہے پر
میں کہتی ہوں تو اب بھی توبہ کر لے۔ یہ روز روز کی نحوست اچھی نہیں ہوتی۔"

"بے بے۔۔۔ اور سب ٹھیک ہے۔ لیکن اسے نحوست نہ کہنا، نہ سمجھنا۔ آج کہے
دے رہا ہوں۔"

قدیرا ہتھے سے اُکھڑ جاتا اور شیفی سہم جاتی کہ اب قدیرے پر کا غصہ، بے بے
اس پر اُتارے گی۔ بے بے کی تو نظریں ہی شیفی کو اپنے جسم کے آر پار گزرتی دکھائی
دیتیں۔ جیسے وہ اپنی ہونے والی پوتی کو اس کی کوکھ کے اندر ہی جلا کر بھسم کر دے گی۔

شیفی دِل ہی دِل میں اس بات کا شکر ادا کرتی کہ قدیرے کو بیٹی ہونے پر اعتراض
تو کیا خوشی ہو گی۔ اسے اپنی سہیلی رانی یاد آ جاتی جو بیٹی پیدا کرنے کے 'جرم' میں ماں باپ
کے گھر بیٹھی تھی۔ اس کے بندے نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ دھی کی ذمہ داری میں نہیں
اُٹھا سکتا۔ اس کے نانکے پال لیں تو پال لیں۔

شیفی جب بھی میکے جاتی تو رانی اس سے ملنے ضرور آتی اور اس کے گلے سے لگ

کر اتنے آنسو بہاتی کہ شیفی کا کندھا بھیگ جاتا پھر وہ شیفی سے کہتی۔

"شکر کیا کر۔ بھاقدیرا دھی مانگتا ہے۔ میں نے تو آج تک ایسا کوئی نہیں دیکھا
جو ربّ سے دِھی مانگے۔ آئی کو تو اوکھے سوکھے 'برداش' کر لیتے ہیں پر مانگتے نہیں۔ میرے
والے نے تو 'برداش' بھی نہیں کی۔"

"اگر قدیرا ایسا ہوتا تو کیا ہوتا؟"

شیفی یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ ابا تو مُدتیں ہوئیں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا تو کیا میں
ویرے کے بوہے پر آ کر بیٹھتی؟

اور پھر وہ دِن بھی آ گیا جس دِن بے بے اور قدیرے کے جھگڑے کا فیصلہ ہونا
تھا۔ قدیرے نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شیفی 'جنیپے' کے لیے پیکے نہیں جائے گی۔

"بے بے، پریشان نہ ہونا۔ میں نے دائی وزیراں سے بات پکی کر لی ہے کہ وہ
پورا چھلا ادھر ہی رہے گی۔ اس کا کونسا کوئی اگا پچھا ہے۔ اپنے گھر میں کلی جان ہوتی ہے۔
یہاں رونق میں اس کا سوا مہینہ گزر جائے گا۔ کھانا پکانا بھی کرے گی۔ خود بھی کھائے گی اور
ہمیں بھی کھلائے گی۔"

شیفی کو دردیں لگی تھیں۔ قدیرا بند کمرے کے سامنے بے چینی سے چکر کاٹے جا
رہا تھا کہ بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ابھی وزیراں نے آ کر بتایا بھی نہیں تھا کہ قدیرے
نے جا بے بے کو جپھا مارا۔

"بے بے، ربّ کی دین آ گئی۔ میری سلامتی شکر اور با میریا۔"

"اوئے پھٹ گھٹا۔ ابھی میری پسلیاں توڑنے لگا تھا۔ اب آرام سے بیٹھ جا۔ صبح
سے ہلکے کتے کی طرح چکر کاٹ رہا ہے۔"

بے بے نے زہر اُگلا۔ اور جا کر اپنی چار پائی پر اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ گئی۔ اصل
میں اسے فوراً بخار چڑھ گیا تھا۔ بخار بھی وہ جو 'اندر' ہوتا ہے باہر محسوس نہیں ہوتا۔ جب بھی

بے بے کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا۔ وہ ایسے ہی بخار میں مبتلا ہو جاتی تھی اور ہر بار 'مرتے مرتے' بچتی تھی۔

چار سال گزر گئے۔ شیفی روز جیتی اور روز مرتی۔ قدیرا تو سلامتی سے بہت پیار کرتا تھا لیکن بے بے، شیفی کا جینا حرام کیے رکھتی۔ بے بے کو تو سلامتی، دُنیا میں آنے سے پہلے ہی منحوس لگتی تھی۔ اُوپر سے ربّ کا کرنا کہ دوسری اولاد کا منہ ہی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

شیفی، بے بے کے طعنے سنتی، کام کرتی جاتی اور آنسو بہاتی رہتی۔ ایسے میں اس کی ہمسائی طفیلاں منڈیر پر سے 'شی' کر کے اسے بلاتی اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھتی۔

''کیا ہوا ہے؟''

شیفی آہستہ سے جواب دیتی۔

''بے بے کہتی ہے سلامتی ایسی نحس آئی ہے کہ میرے پتر کا وارث ہی نہیں آیا اس کے بعد۔''

''تو اس سے پوچھ کہ تیرا پتر ایسا کونسا جگیردار ہے کہ جس کو وارث نہ ملا تو اس کا 'تخت ہزارہ' کھس جائے گا اور قدیرے کو سمجھا کہ اپنی ماں سے کہے اب بیٹھ کر پوتا اُڈیکے۔ اس نے گھر آئی رحمت کی ''نندیا'' کر کے ربّ کو ناراض کیا تھا۔ اب اسے منالے۔ تو کیا کر سکتی ہے؟''

پھر طفیلاں، شیفی کو حوصلہ دیتے ہوئے مذاق میں کہتی۔

''تو بے بے سے کہتی کیوں نہیں کہ پتر پیدا کرنے کا 'نخسہ' تجھے بتا دے تیری زندگی آسان ہو جائے گی۔''

''اتنی بڑی بات میں کیسے کہوں؟ وہ نہیں سمجھتی کہ یہ تو ربّ سوہنے کی مرضی ہے۔''

شیفی دِل مسوس کر رہ جاتی پر طفیلاں باز نہ آتی۔

''بے بے کی اپنی تو ایک قدیرے کے بعد بس ہو گئی۔ تیرے پیچھے ڈنڈا چا ہڑی

رکھتی ہے۔ پر بھئی وہ ہے سچّی۔ جمیا اس نے منڈا ہے۔ تو اس سے 'نخسہ' لے لے۔۔۔ خبرے ربّ سلامتی کو ویر دے ہی دے۔''

''چھڈ اڑیے، تو بھی حد کرتی ہے۔'' شیفی روتے روتے ہنس دیتی۔

سلامتی سترہ سال کی تھی کہ بے بے گزر گئی۔ قدیرے کے وارث کو نہ آنا تھا نہ آیا لیکن یہ سال شیفی پر قیامت کے گزرے۔

سلامتی ۱۹ سال کی ہوئی تو اس کی بات ساتھ کے پنڈ میں پکی ہو گئی۔ جب اس کے سوہرے اس کی تلی پر روپیہ رکھ کر واپس گئے تو شیفی جذباتی ہو گئی۔

''قدیریا، سلامتی چلی گئی تو ہم کلّے رہ جائیں گے۔ کیا کریں گے؟'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''ڈنڈے بجائیں گے۔ یہ بات پہلے سوچنی تھی۔ کوئی اور کیوں نہ جمیا؟ اب کیا فیدہ؟'' قدیرے کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

شیفی نے سوچا، طفیلاں کی بات مان کر بے بے سے 'نخسہ' پوچھ ہی لیتی تو اچھا تھا یہ دِن تو نہ دیکھنا پڑتا۔

ایک ہفتے کے بعد، شیفی نے قدیرے سے کہا۔

''قدیریا، پیسے دے پھر تیاری شروع کریں کچھ چیزیں تو میں ساتھ ساتھ بچت کر کے بناتی رہی ہوں۔ گہنے بھی میرے والے کام آ جائیں گے۔ پھر بھی سوئی سلائی کرتے کرتے کافی خرچا ہو جائے گا۔ اب دِن متھ لیے ہیں۔ گنے منے دِن تو گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔ چھیتی چھیتی سب کام کرنے پڑیں گے۔''

شیفی نے اُداسی مگر چاؤ سے کہا۔

''میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ تین کپڑوں میں ٹورنا ہے تو جب مرضی آئے ٹور دے۔''

"کیا؟؟؟"

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے؟ کیا ہے میرے پاس؟ کہے تو زمین، کو 'اگ' لگا دیتا ہوں دیہج بنانے کے بعد جو پیسے بچیں گے ان سے مجھے ایک ٹھوٹھا خرید دینا۔ چورا ہے میں بیٹھ جایا کروں گا۔ آخر روٹی تو کھانی ہے نا!"

"خیری صلاّ۔ ایسی باتیں کیوں نکالتا ہے منہ سے۔ دھی کو ٹورنا ہے اور تو کیسی بے سگنی کر رہا ہے۔"

شیفی کا جسم سنسنا رہا تھا۔ وہ بہت حوصلے سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

"بے سگنی شگنی کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے جو بتانا تھا بتا دیا۔ اب دفع ہو جا میرا دماغ خراب نہ کر۔"

"قدیریا یہ بات تو مجھے پہلے کہتا۔ تجھے تو اس بات کا پتا تھا کہ تیرے پاس کچھ نہیں ہے مجھے بھی بتا دیتا تو ہم سلامتی کی بات ہی نہ چلاتے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟" شیفی روہانسی ہو گئی۔

بے بے اگر زندہ ہوتی تو شیفی شاید یہ سمجھتی کہ قدیرا اس کے کہنے پر ایسا کر رہا ہے لیکن لگتا تھا بے بے کی رُوح قدیرے میں حلول کر گئی تھی اور وہ اسی کی زبان بول رہا تھا۔

"اور وہ جو تیرے بھرا چوہدری علی اصغر نے چارسیاڑ تیری تلی پر رکھ کر میری سات پشتوں پر احسان کیا ہے۔ بڑا مومن بنا پھرتا ہے۔ وہ کس دِن کام آئیں گے؟ انھیں بیچ لے۔ تیرے پاس بھی تو زمین ہے۔"

اگلے روز شیفی سویرے ہی پیکے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ سلامتی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ ستا ہوا۔ شیفی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سلامتی نے باپ کی باتیں سن لی ہیں۔ اس نے سلامتی کو گلے سے لگا لیا۔

"دھیئے، پیکے سے وداع ہونا کوئی سوکھا کم نہیں ہے۔ پر ایسے روتے ہیں؟ ہے

ناسدین" سلامتی کے چہرے پر اُداس مسکراہٹ اُبھری۔

"اماں تو کہاں جا رہی ہے؟"

"دھیئے، ویر کو بھی بتا آؤں۔ آخر اس نے بھی 'نانکی شک' کی تیاری کرنی ہے۔"

"اماں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ابّے سے کہہ دے مجھے تین کپڑوں میں ہی ٹور دے اگر میرے سوہرے مجھے اس بات پر تنگ کریں گے تو نہر میں چھلانگ لگا دوں گی۔ واپس نہیں آؤں گی۔ وہ فکر نہ کرے۔"

شیفی کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

"نہ میری دھی۔ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟"

"اماں میں سب جانتی ہوں۔ تو کیا سمجھتی ہے مجھے کسی بات کا پتا نہیں؟"

شیفی اس کی بات سنی ان سنی کر کے، آنسو بہاتی چلی گئی۔ اور پھر منہ نیچا کر کے علی اصغر سے کہا کہ اس کی زمین بیچ دے۔

"کیوں، خیر ہے؟"

"ویرا، سلامتی کے دِن متھے ہیں نا! اس کے ویاہ کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔"

"وہ تو جب دِن متھے تھے تو میں وہیں تھا مجھے کیا بتا رہی ہے؟ پر زمین بیچنے والی بات اس میں کہاں سے آ گئی؟"

"ویرا، میری اکّو اِک دِھی ہے۔ سچی بات ہے میں اپنے ہاتھ سے بھی اسے کچھ دینا چاہتی ہوں۔"

"جھلّی نہ ہو تو، میں سمجھتا ہوں۔ پر زمین بیچ نہ، ویسے ہی اس کے نام کر دے۔"

"نہیں لالہ۔"

شیفی نے اِتنا زور دے کر کہا کہ بھرجائی نے جیسے کچھ بھانپ لیا۔ اس نے اپنے بندے کے موڈھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور سر ہلا کر اسے اِشارہ کیا۔

علی اصغر نے بات کو سمجھتے ہوئے شفیی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور کتنی دیر کچھ نہیں بولا۔۔۔ لیکن شفیی کو جیسے ٹھنڈ پڑ گئی۔

''زمین میں خود ہی رکھ لوں گا۔ کچھ دِنوں تک پیسے تجھے دے آؤں گا۔ ایسے کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔''

شفیی ہلکی پُھل ہوگئی۔ ایک ہفتے کے بعد علی اصغر آ کر اسے رقم دے گیا۔

اگلی صبح شفیی نے طفیلاں سے کہا''اب سویرے سویرے کم مُکا لیا کر۔ تیری بھنویں سلامتی کے ویاہ کی تیاری شروع کریں۔''

لیکن سلامتی کسی چیز میں دِل چسپی نہیں لے رہی تھی۔ چپ چپ، اُداس اُداس شفیی کو یہ بات بہت محسوس ہوتی۔ ایک دِن اس نے سلامتی سے کہا۔

''دھیئے تو خوش نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے تجھے ماں کی دی ہوئی چیزیں تو قبول نہ ہوئی نا۔ چنگا دھیئے میرے نصیب۔ میں تو بڑے چاواں سے تیاری کر رہی ہوں۔''

شفیی بلکی۔

''نہیں اماں یہ بات نہیں ہے۔ پر ابّے پر تو میرا مان ختم ہو گیا نا!''

''تو ساتھ ہی ماں پر بھی ختم کر دے گی سدین نہ ہو تو۔''

''نہیں اماں، میرا دِل چاہتا ہے میں ابے سے فرمیشیں کرتی۔ ریلاں، جمیلاں، پری بند۔۔۔ اور پتا نہیں کیا کیا؟ تو مجھے جھڑکتی، سلامتی اپنے ابّے کو تنگ نہ کر تُو تو بڑی بی بی دِھی ہے۔ ابا مجھے گلے سے لگا لیتا اور میرے کان میں کہتا۔

''اپنی ماں کی باتوں کا غصہ نہ کریں دھیئے۔ تو مجھے بتا اور کیا چاہیے؟ سارا کچھ تیرا ہی تو ہے۔''

اماں، باپ تو قرضئی ہو جاتے ہیں، بِک جاتے ہیں۔ ابا، کیسا باپ ہے؟ بات چیزوں کی نہیں ہے بات تو ان سدھروں کی ہے جو دِل میں مر گئیں۔''

شفیی جواب میں کیا کہتی؟ اسے تو دوہرا دُکھ تھا۔ ایک تو یہ کہ قدیرا ربّ سے دِھی تو مانگتا رہا پر باپ والے فرض پورے نہ کیے اور دوسرا یہ کہ اس نے شفیی کی زمین پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ حالانکہ شفیی نے وہ کہاں لے جانی تھی؟ آج بھی سلامتی کی تھی اور کل بھی۔

پھر ماں بیٹی گلے لگ کر خوب روئیں اور اس کے بعد یہ ذِکر دونوں کے درمیان دوبارہ نہ چھڑا۔ لیکن قدیرا بلا وجہ ٹُونے لگا تا رہتا۔

''شفیی یہ تو کیا منجیاں پیڑھیاں اکٹھی کر رہی ہے۔ عقل کر۔۔۔ آج کل تو لوگ 'فرجاں' دیتے ہیں۔ ٹی وی نہ دے، فرج تو لے کر دے۔ لوگ کیا کہیں گے کلّی کلّی کُڑی بیاہی اور لیر پلیر اکٹھا کر کے دے دیا۔''

''اچھا قدیریا، سلامتی کو 'مجھ' کونسی دینی ہے؟''

شفیی نے بڑے رسان سے کہا۔

''مجھ؟''

قدیرا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

''آج کل تو میرے پاس کوئی ایسی مجھ نہیں ہے۔ جو دہج میں دینے والی ہو۔ پھر کبھی دے دوں گا۔''

''اس بات پر لوگ کچھ نہ کہیں گے کہ کلّی کلّی دِھی بیاہی۔۔۔''

شفیی کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ قدیرا لال پیلا ہو گیا۔

''بہت ودھ ودھ کے باتیں کرنے لگی ہے تو اپنی دِھی ویاہ رہی ہے۔ میرے پر کوئی احسان نہیں کر رہی جو دینا ہے دے مَر لے۔ مجھے معنے دینے کی کوئی لوڑ نہیں۔''

آخر شادی کا دِن آ گیا۔ رُخصتی کے وقت سلامتی، ماں سے گلے مِل کر ایسے روئی کہ واقعی چوبارے کی چارے کندھیں ہل گئیں۔

ہچکیاں لیتے ہوئے سلامتی نے ماں کے کان میں کہا۔

"امّاں، ابے سے کہنا میں نے جتنے سال اس کی زمین کا اناج کھایا ہے وہ مجھے معاف کر دے۔ مجھے اس سے بڑا پیار تھا لیکن اس نے میرے پیار کی قدر نہیں کی۔"

سلامتی نے ڈولی میں پاؤں رکھا تو شیفی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ سلامتی کا سوہرا آگے بڑھا اور شیفی سے کہنے لگا۔

"بھین، دِل تھوڑا نہ کر۔ میں سلامتی کو دِھی بنا کر لے جا رہا ہوں تو بے فکر ہو جا۔"

شیفی کا دِل چاہا زور سے چیخے۔

"ربّ کا واسطہ اسے دِھی نہ بنانا۔ بہو ہی رہنے دینا بھرا۔"

□□□

ابلہی بنامِ دِین و دانش

میری شدید خواہش تھی کہ اسے ضابطۂ تحریر میں لاتی مگر۔۔۔

'میں کچھ دِن اور جینا چاہتی ہوں'

فرمائش

''بھئی تمہارے ابا میاں نے تو مجھ پر بہت بڑا کرم کیا جو تمہیں یہ نصیحت کر کے بھیجا کہ شوہر سے کبھی کوئی فرمائش نہ کرنا۔ ایسا اچھا سسر تو مجھ جیسے نصیب والے کو ہی مِل سکتا تھا۔''

عقیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان لوگوں کی شادی اوائل سردیوں میں ہوئی تھی اور اب کڑکتی گرمیوں میں بھی وہ موٹے ریشمی سوٹ پہنے پھر رہی تھی لیکن عقیل سے لان کے سوٹ دِلانے کے لیے نہیں کہا تھا۔

شروع شادی کے پیار محبت اور چاؤ چونچلے والے دِنوں میں اور پاؤں بھاری ہونے پر بھی راحت نے کبھی، عقیل سے کسی کھانے پینے کی چیز کی فرمائش کی تھی اور نہ ہی پہننے اوڑھنے کے لیے کچھ دِلانے کو کہا تھا۔ ایک روز دفتر سے واپسی پر عقیل نے راحت کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا۔ اس میں لان کے دو سوٹ تھے اور کہنے لگا۔

''بیگم میں انتظار میں ہی رہا کہ تم کبھی تو کسی چیز کی فرمائش کرو گی۔ لیکن تھک ہار کر آخر مجھے خود ہی پہل کرنا پڑی میری شادی ہونے سے پہلے جب میرے شادی شدہ دوست اکثر اس بات پر شاکی نظر آتے تھے کہ ان کی بیویاں طرح طرح کی فرمائشیں کر کے ان کا

ناطقہ بند کیے رکھتی ہیں تو اس بات کو ذہن میں رکھ کر میں ابھی تک ڈرا سہما ہی رہا کہ نہ جانے تم کس کس چیز کی فرمائش کرو گی؟ لیکن تم تو بہت مختلف ہو ایسی سیر طبیعت بیوی بھی کس کام کی۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں پڑی سب کچھ ہی تو ہے میرے پاس۔ میں تو صرف آپ کی محبت کی طلبگار ہوں۔" راحت نے دھیرے سے کہا۔

"پھر بھی؟" عقیل نے جواباً کہا۔

راحت نے وضاحتاً سادگی سے بتایا "میری رُخصتی سے ایک روز پہلے، ابّا میاں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہنے لگے:

"راحت مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔ مجھے اس سے بہت سی اُمیدیں ہیں۔ بس ایک بات میں تم سے کہنا چاہوں گا۔ عقیل میاں سے کبھی کوئی فرمائش نہ کرنا۔ میں نے انکم ٹیکس کے محکمے میں نوکری کی ہے۔ اس بدنام محکمے میں رہ کر بھی خدا کے فضل سے بہت نیک نامی کمائی ہے۔ لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں۔ میرا ضمیر بھی مطمئن ہے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ تمہاری اماں کا رویہ ہے۔ انھوں نے آج تک مجھ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ جیسے تیسے میری تنخواہ میں گزارہ کیا۔ حالانکہ میری تنخواہ کا ایک بڑا حصہ تمہارے دادا جان کی بیماری اور تم بہن بھائیوں کی تعلیم پر خرچ ہو جاتا تھا۔ چونکہ تمہاری اماں نے مجھے بے جا تنگ نہیں کیا اس لیے میں بھی کوئی غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہوا۔ میں اپنی بیٹی سے بھی اسی بات کی توقع رکھتا ہوں۔ یوں بھی شوہر کی خوشنودی حاصل کرنا ہر اچھی بیوی پر لازم ہے۔"

اسی وقت میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آپ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔"

"وقت گزرتا گیا۔ لیکن اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقیل اپنے فرائض سے بھی غافل ہو گیا۔ اس نے راحت کے ناز نخرے تو کیا اُٹھانے تھے اس کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا

چھوڑ دیا۔ وہ کیا کھاتی ہے؟ کیا پہنتی ہے؟ اسے کسی کو کچھ دینا دلانا تو نہیں؟۔۔۔ عقیل نے سب کچھ بھلا دیا۔

راحت کی سہیلی صغرا اسے سمجھاتی:

"دیکھو راحت، تمہارے ابّا میاں نے یہ تو نہیں کہا تھا نا کہ تم اپنی ضروریات کے لیے بھی منہ مت کھولنا۔ تمہارا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں کہے دیتی ہوں، بہت پچھتاؤ گی۔"

"میں کیوں کہوں؟ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ انھیں بھی تو سب معلوم ہے نا!"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بنی ہوئی بات ہے کہ جب تک بچہ نہ روئے ماں بھی اسے دودھ نہیں پلاتی۔"

"وہ کیسی ماں ہوئی پھر، جسے خود سے اس بات کا احساس نہیں ہوتا؟"

راحت، ماہانہ اخراجات کے لیے عقیل کی دی ہوئی رقم کو پھونک پھونک کر خرچ کرتی۔ اللہ نے اولاد کے نام سے ایک بیٹی دی تھی۔ گھرانہ تو بہت چھوٹا تھا لیکن مہمانداری بہت زیادہ تھی۔ مہینے کے آخر میں، راحت کا دِل دھڑکتا ہی رہتا کہ خدا کرے کوئی مہمان نہ آ جائے۔ کیونکہ عقیل مہینے کے شروع میں ہاتھ کھینچ کر، بندھی ٹکی رقم اسے دیتا اور پھر اس کے بعد وہ پوچھنا بھی گوارا نہ کرتا کہ اس نے کیسے اس میں گزارہ کیا؟ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے راحت نے محلے کی خواتین کے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ وہ پڑھی لکھی ضرور تھی لیکن اتنا نہیں کہ کوئی نوکری کر سکتی۔ البتہ ہاتھ میں صفائی بہت تھی۔ اسے اتنے کپڑے سلائی کے لیے ملنے لگے کہ وہ اپنی ضرورتیں اور بیٹی کے لاڈ پیار پورے کرنے کے قابل ہو گئی۔

وقت اسی تیزی سے گزرا، جس تیزی سے گزرا کرتا ہے۔ آخر بیٹی کی شادی کے دِن آ گئے۔ اس کے جہیز کی بہت سی چیزیں، راحت نے اپنی محنت کی کمائی سے بنائی تھیں۔

عقیل ریٹائر ہو گیا۔ اب اسے سرکاری رہائش گاہ چھوڑنا تھی۔ گاؤں کی زمین بیچ کر اس نے شہر میں بیٹی کے نام پر زمین خریدی اور اس پر گھر بنانا شروع کر دیا۔

ایک روز راحت نے عقیل سے کہا۔

’’آپ سفینہ کے نام پر گھر کیوں بنا رہے ہیں، اپنے نام پر کیوں نہیں؟‘‘

’’تم نہیں سمجھتیں، اگر نرینہ اولاد نہ ہو تو وفات کے بعد، اس شخص کی جائیداد کا بڑا حصہ اس کے بھائیوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اولاد کو بہت تھوڑا ملتا ہے۔‘‘

راحت چپ ہو رہی۔

ابھی گھر مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ عقیل شدید عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گیا۔ جب تک وہ صحت یاب ہوا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ بیٹی سسرال میں رہ رہی تھی راحت دِن رات عقیل کی خدمت کرتی اور اس کی زندگی کی دعائیں مانگتی۔ اندر ہی اندر اسے یہ سوچیں مارے ڈالتیں کہ اگر عقیل کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ بالکل اکیلی پڑ جائے گی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی زندگی بھی عقیل کے نام کر دیتی۔

ایک رات، راحت انھی سوچوں میں گم سوئی اور رات بھر پریشان کر دینے والے خواب دیکھتی رہی۔ صبح اس کی طبیعت میں بے چینی تھی۔ ناشتہ دونوں میاں بیوی نے برآمدے میں بیٹھ کر کیا۔ عقیل اخبار دیکھ رہا تھا۔ راحت نے جھجکتے جھجکتے اس سے کہا:

’’خدا آپ کو لمبی، صحت مند زندگی دے۔ میں آپ کے ہاتھوں میں رُخصت ہو جاؤں اور آپ اپنے کندھوں پر مجھے میری آخری منزل تک پہنچائیں لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر آپ بارہ مرلے کے مکان میں سے تین مرلے ہی میرے نام کر دیتے۔‘‘

عقیل یکدم غصے سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

’’مجھے اندازہ تھا کہ تم مجھ سے یہ ’فرمائش‘ ضرور کرو گی۔ عورت کتنی بھی بدل جائے اس کی بنیادی خصلت تو وہی رہتی ہے نا!‘‘

وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

’’تم میرا مرا ہوا منہ دیکھنا چاہتی ہو، اس لیے اپنے ٹھکانے کی فکر ہو رہی ہے تمھیں۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔ میں دِکھاتا ہوں تمھیں۔۔۔ میں جانتا تھا۔۔۔‘‘

وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا گیٹ کے باہر لے گیا اور چلّایا۔

’’یہ دیکھو۔۔۔ یہ دیکھو۔‘‘

اس نے گیٹ کے اُوپر دیوار میں سیمنٹ سے بنایا گیا آٹھ انچ مربع کا چوکھٹا دِکھایا، جس میں تختی لگ سکتی تھی۔ اس سے پہلے، راحت کا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

’’اس پر راحت منزل لکھوا کر لگوا لو تمھاری تسلی ہو جائے۔‘‘

اس رات، راحت کا تکیہ بھیگتا رہا۔

وہ اپنے دِل کی ساری باتیں اپنی پیاری سہیلی صغرا سے کہہ لیتی تھی۔ صبح اُس نے، صغرا سے ذِکر کیا تو وہ بھڑک اُٹھی۔

’’حد کرتے ہیں عقیل بھائی بھی۔ تختی لگوانے سے یہ گھر تمھارے نام ہو جائے گا کیا؟ اب میرے تین بیٹے ہیں لیکن تمھارے بھائی نے یہ گھر میرے نام پر بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کل کی کیا خبر؟ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن خدا جانے کیسی بہوئیں آئیں اور بیٹوں کا رویہ تمھارے ساتھ کیسا رہے۔ کم از کم تمھیں تحفظ کا احساس تو رہے۔‘‘

پھر صغرا نے اپنا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے کہا۔

’’بنی ہوئی بات ہے، زمین جائیداد بھی عورت کا خصم ہوتی ہے۔‘‘

راحت یہ بات دِل کو لگا بیٹھی اور بیمار رہنے لگی۔

ایک روز صغرا اس سے ملنے آئی تو وہ بستر میں لیٹی، منہ ہی منہ میں کچھ بُدبدا رہی تھی۔

’’کیا کہہ رہی ہو راحت؟ میں بھی تو سنوں۔‘‘ صغرا نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

’’کچھ نہیں یونہی ایک شعر یاد آ گیا تھا۔‘‘ راحت نے اُداسی سے مسکراتے ہوئے

کہا۔

''ارے واہ۔۔۔ یہاں شعروشاعری ہورہی ہے اور ہم فکر میں مرے جارہے ہیں۔ مجھے بھی توسناؤ۔''

''پنجابی شعر ہے:

؎ نالے بھرم گوایا اپنا ، نالے مان وی ٹُٹّا
کی لبھا اوس تھوڑ دِلے دے اگے کاسا کر کے

ساتھ ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

راحت روز بہ روز کمزور ہوتی جارہی تھی اسے یہ احساس مارے ڈالتا تھا کہ آخری عمر میں ابا میاں کی نافرمانی سے اسے جو شرمندگی اُٹھانا پڑی ہے وہ اسی نافرمانی کی سزا ہے۔

آخر وہ دِن بھی آن پہنچا، جس سے کسی کو مُفر نہیں۔

عقیل نے بیوی کی حالت دیکھتے ہوئے بیٹی کو بلا بھیجا۔ وہ روتی بلکتی ہوئی آئی تو راحت اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔

''بیٹی۔۔۔ سبھی بیٹیوں کو ایک دِن رُخصت ہونا ہوتا ہے اور پھر سبھی مائیں ایک دِن رُخصت ہوجاتی ہیں۔ میرے بعد رونا نہ۔۔۔ اپنے گھر کو سنبھالنا۔''

راحت، سفینہ کو گلے سے لگائے رُک رُک کر کہہ رہی تھی۔

''اور۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں نے اپنی سلائی کی کمائی سے اپنا کفن خریدا تھا اور جب صغرا اور شفقت بھائی حج پر گئے تھے تو ان سے 'فرمائش' کی تھی کہ اسے آبِ زم زم میں بھگو لائیں اور خاکِ پاک سے اس پر کلمہ شریف لکھوالائیں۔ وہ اُوپر رضائیوں والی پیٹی میں ایک بیگ میں بند پڑا ہے مجھے وہ پہنا کر رُخصت کرنا۔ اب اسی طرح میرے گلے سے لگی رہو۔ تمہارا بھی خدا حافظ اور میرا بھی۔''

سسکیاں بھرتی سفینہ نے کفن نکالنے کے لیے بیگ کھولا تو اس میں تحفے کی طرح

سجا سنوار کر بند کیا ہوا ایک وزنی ڈبہ بھی پڑا تھا۔ سفینہ نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا تو اس میں کتبے کی شکل کا ایک پتھر تھا، جس پر جلی حروف میں

راحت منزل

لکھا تھا۔ ساتھ میں راحت کے ہاتھ کی تحریر تھی۔

''میری 'فرمائش' ہے کہ اسے میری آخری رہائش گاہ پر لگا دیا جائے۔''

□□□

تھرسٹی کرو

"عاطف، جمعہ کی شام کو میں بھائی جان اور امّی سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ ہفتہ کے روز دوپہر تک لوٹ آؤں گی۔ پچھلی بار میں گئی تھی تو امّی، کچھ فکرمند، کچھ خاموش سی تھیں لیکن میرے بار بار پوچھنے پر بھی انھوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم لوگ بھی 14 راگست منائیں گے۔ میرا مطلب ہے یومِ آزادی ۔۔۔ کیوں بھئی بچّو؟"

"Wow....w...." بچوں نے بھی اپنے بابا کے اِشارے پر 'نعرۂ آزادی' بلند کیا۔

"آپ لوگ زیادہ خوش نہ ہوں، مجھے گھر پر کچھ کام نپٹانے ہیں۔ اس لیے میں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

"جایئے بیگم صاحبہ جایئے۔ ہم نے آج تک کبھی جرأت کی ہے بھلا آپ کو منع کرنے کی ۔۔۔ ویسے اب تو شادی کو اتنے سال ہوگئے ہیں کہ زاہد فخری کا فرمان بالکل صحیح ،لگتا ہے۔

'کدی تے پیکے جا ، نی بیگم
سینے وچ ٹھنڈ پا ، نی بیگم

کٹھیاں رہ رہ تھک گئے آں ہن
ٹینڈیاں وانگوں پک گئے آں ہن'"

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔ بس کریں۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنا ٹوُر ملتوی کر دوں اور آپ کی خوشی ادھوری رہ جائے۔"

شبنم نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا۔ عاطف اور شبنم کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے۔ دو بچے تھے۔ شان اور رمیزہ۔ عاطف مقامی گورنمنٹ کالج میں جغرافیہ کا پروفیسر تھا۔ اور شبنم ایک غیر ملکی بینک میں جاب کر رہی تھی۔ عاطف کی والدہ ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ وہ اتنی صلح جو اور محبت والی خاتون تھیں کہ شبنم کو ساس بہو والے سارے قصے جھوٹے لگتے تھے۔ اُلٹا جب شبنم اپنی کولیگز کو اپنی ساس کی محبت کے انداز اور گھر داری میں ان کی مدد کی بات کرتی تو وہ لوگ اسے رشک اور شک کی ملی جلی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بے اختیار کہتیں۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟ ۔۔۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔"

"دیکھو، بھلا میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ وہ ہیں ہی بہت محبت والی خاتون۔ ادھر بھائی کے ہاں جاؤں تو امّی اتنی اچھی ہیں کہ کیا بتاؤں؟ وہ خاطریں خدمتیں کرتی ہیں کہ مجھے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ گرمیوں اور سردیوں کے شروع میں چھ چھ سوٹ سلوا کر، ساتھ دوپٹے رنگوا کر بھجواتیں ہیں کہ اسے جاب کی وجہ سے وقت نہیں ملتا۔ عید، شب برات، میری، عاطف اور بچوں کی سالگرہ ہیں الگ۔۔۔ بینک کی جاب خواتین کے لیے بہت مشکل ہے۔ لمبے اوقاتِ کار۔۔۔ اور گھر کی ذمہ داریاں الگ۔ لیکن مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ عاطف کالج سے واپسی پر، بچوں کو سکول سے لیتے ہوئے گھر آتے ہیں۔ اور جب میں گھر پہنچتی ہوں تو وہ نہا دھو کر نائیٹ سوٹ پہنے، ہوم ورک سے فارغ ٹی وی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر ہم سب مِل کر ڈِنر کرتے ہیں اور بس۔"

''چھوڑو اس کی الف لیلیٰ۔۔۔ایسی کہانیاں تو اس کے پاس بھری پڑی ہیں۔۔۔''

لیلیٰ نے مصنوعی بیزاری سے کہا۔

یہ لوگ بینک میں لنچ بریک میں بینک ہی کی کینٹین پر کھانا کھا رہی تھیں۔

''اور مزے کی بات یہ کہ جب کبھی اپّی اور بھائی جان ہمارے ہاں آتے ہیں تو امّاں ایسے طرح طرح کے کھانے تیار کرتی ہیں جیسے ان کی اپنی اولاد کئی سال کے بعد پردیس سے آ رہی ہو۔اپّی بھی بچوں، میرے اور عاطف کے لیے لائے گئے تحائف کے ساتھ ساتھ، امّاں کے لیے بھی بہت قیمتی اور خوبصورت سوٹ لاتی ہیں۔امّاں، سوٹ کو آنکھوں کے ساتھ لگاتی ہیں اور اپّی کو پیار کر کے ڈھیروں دُعائیں دیتی ہیں۔کھانے سے فارغ ہو کر چائے پیتے ہوئے ہم باتیں کرتے ہیں تو کتنی رات بیت جاتی ہے۔امّاں کی آدھی باتیں تو میری شان میں قصیدے پر مشتمل ہوتی ہیں۔

''میرے جیسی بہو تو کسی قسمت والی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔''

جواب میں اپّی کی آنکھیں چمکتی ہیں اور وہ بڑے فخر سے کہتی ہیں۔

''دیکھ لیجیے امّاں میری نند جیسی لڑکی تو۔۔۔''

''سرچ لائیٹ سے ہی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔'' عاطف بھی بہت شوخ ہو جاتے ہیں پھر کہتے ہیں۔

''کوئی میری رائے بھی تو لے لے۔۔۔میں بے چارا۔'' شبنم کا مطمئن چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

''اب کی بار اپّی آئیں تو مجھے بتانا میں ایک ہی بار میں، امّاں، اپّی اور عاطف بھائی کی غلط فہمیاں دُور کر کے آؤں گی۔تم نے اتنے سال سے اس قدر شریف اور اچھے لوگوں کو اندھیرے میں رکھا ہوا ہے۔۔۔غضب خدا کا۔''

فریسہ نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''مجھے کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔''

شبنم نے ناک سکوڑ کر کچھ سونگھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو جیسے تم alien ہو اور کسی اور سیارے کا ذکر کر رہی ہو۔۔۔آخر تم ایسا کیا کرتی ہو جو۔۔۔؟''

لیلیٰ نے کہا۔

''نہ مانو مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہے۔میں سر کے بل کھڑی رہوں اور وہ لوگ میری محبت کی قدر نہ کریں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔''

شبنم نے جذباتی انداز میں کہا۔

''وہی جو ہم لوگ اتنے اتنے برسوں سے سر کے بل کھڑی ہو کر کر رہی ہیں۔۔۔منّتیں، سماجتیں، خوشامدیں، خاطریں، خدمتیں۔۔۔اور کیا کیا کرتے ہیں ہم لوگ؟۔۔۔بتاؤ نا! مجھے اس وقت خمارِ گندم کی وجہ سے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔''

فریسہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

شبنم آٹھویں کلاس میں تھی کہ اس کی امّی اچانک وفات پا گئیں۔بھائی جان نے ابھی ابھی سروس شروع کی تھی ابا میاں نے چند ہی روز کے اندر اپنے دوست کی بیٹی سے ان کا رشتہ طے کر کے شادی کر دی کہ گھر کی گاڑی رواں دواں رہے۔بھابی جنھیں شبنم اپّی کہتی تھی ایسی خوش قدم آئیں کہ انھوں نے آتے ہی گھر کو یوں سنبھال لیا کہ جیسے کوئی تجربہ کار خاتون بھی کیا سنبھالتی ہوگی۔وہ ابھی بی۔اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں کہ بیاہ دی گئیں۔شبنم سے عمر کا فرق کافی تھا لیکن، دونوں ہی خوش طبیعت تھیں۔اس لیے خوب نبھنے لگی۔اپّی اس کی بہت اچھی دوست تھیں لیکن جہاں وہ محسوس کرتیں کہ انھیں شبنم کی بڑی بننا ہے وہاں وہ یہ فرض بھی سمجھ اور غیر محسوس طریقے سے نبھا جاتیں۔

ایک روز شبنم سکول سے واپس آئی تو اپّی نے اسے بتایا۔

''شبنم، میرے رِشتے کے چچازاد بھائی کی شادی ہے۔ وہ ایئرفورس میں آفیسر ہیں۔ ہم سب چلیں گے۔۔۔ آج کل موسم اچھا ہے اور پھر گاؤں کی شادی کا مزا ہی الگ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا!''

اپّی نے گویا پروگرام پر فائنل کی مہر لگادی۔

شادی والے گھر میں ان لوگوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ دولہامیاں اپنے خاندان کے پہلے پڑھے لکھے شخص تھے۔ اُوپر سے ایئرفورس میں آفیسر لیکن جس نے بھی دُلہن کو دیکھا، دانتوں تلے اُنگلی دبالی۔ وہ دُلہا کی خالہ زاد تھیں۔۔۔ یہ لحیم شحیم گہری سانولی اور بقول شبنم کے 'مردانہ وار' قسم کی دُلہن، فلائیٹ لیفٹیننٹ فرید احمد کے ساتھ یقیناً زیادتی تھی جو کہ اچھے خاصے خوش رو، خوش اخلاق اور سمارٹ تھے۔

جب وہ اپنے کولیگز، جو شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے کے ساتھ بہت خوبصورت لہجے میں انگلش میں بات کر رہے تھے تو دُلہن منہ پھاڑے ان لوگوں کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

شبنم نے اپّی سے سرگوشی میں بات کی۔

''اتنی بے جوڑ شادی کا برائیٹ آئیڈیا کس کے ذہن کی پیداوار ہے؟''

''چپ کرو۔۔۔ میں تو پہلے ہی اس صدمے سے نکل نہیں پا رہی۔ لیکن فرید بھائی کو تو شاید اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ کیسے خوش باش ہیں اور مہمانوں میں بیٹھے چہک رہے ہیں۔''

شادی سے واپس آنے کے بعد، کئی راتوں تک، فراغت کے وقت شبنم اور اپّی کے درمیان یہ 'بوالعجب' جوڑا زیرِ بحث رہا۔

بھائی جان کی شادی کو ایک سال ہوا تھا کہ ایک پیارا سا منّا اُن کے گھر کی رونق بڑھانے کے لیے آ گیا۔ اب تو سب لوگ اسی کی بات کرتے اور اسی کے ساتھ مصروف رہتے۔

کوئی دو ماہ بعد فرید بھائی اور زینت بھابھی اچانک اُن لوگوں کے ہاں چلے آئے۔ اُن کی پوسٹنگ عارضی طور پر انھی کے شہر میں ہوگئی تھی۔ فراز بیس تین ماہ کے لیے Activate ہوا تھا اور اِس عرصہ کے لیے، جن افسران کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ اُن میں فلائیٹ لیفٹیننٹ فرید احمد بھی شامل تھے۔ بھائی جان نے بہت زور دیا کہ وہ اُن کے گیسٹ رُوم میں شفٹ ہو جائیں، زینت بھابھی دِن میں اکیلی ہوں گی اور بور ہوتی رہیں گی۔ لیکن فرید بھائی کسی صورت نہ مانے۔

کہنے لگے ''بیس پر شادی شدہ افسران کو دو کمروں کی رہائش ملی ہے۔ کھانا میس سے آئے گا۔ زینت کو گھر داری نہیں کرنا پڑے گی۔ ہم لوگ ہنی مون کے لیے نہیں جا سکے۔ یوں یہ ہمارا ہنی مون پیریڈ ہوگا۔''

''فرید بھائی آپ کی عظمت کو سلام۔'' شبنم دِل ہی دِل میں کہہ کر بے آواز ہنسی۔

آخر کار بحث اس بات پر ختم ہوئی کہ رات کا کھانا وہ سب بھائی جان کے گھر میں اکٹھے کھایا کریں گے۔

شام کو فرید بھائی اور زینت بھابھی آئے تو فرید بھائی نے زینت بھابھی کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''شبنم یہ میری بیگم ہیں۔۔۔ جو کہ دراصل 'بے غم' ہیں۔''

وہ بالکل بھابھی کے پیچھے کھڑے تھے۔ بھابھی کی لمبائی چوڑائی اِس قدر زیادہ تھی کہ فرید بھائی اچھی خاصی قدامت اور جسامت کے باوجود سامنے سے نظر نہیں آ رہے تھے۔

اُن کی شادی پر یہ سب لوگ چار پانچ روز اکٹھے رہے تھے۔ اس لیے کافی بے تکلفی ہوگئی تھی اور اب تو روزانہ ہی ملاقات ہو رہی تھی۔

شبنم اِن دِنوں میٹرک کر رہی تھی۔ سکول سے واپسی پر وہ رات کا کھانا جو نسبتاً اہتمام سے بنایا جاتا تھا، میں اپّی کی مدد کرتی، پھر اپّی کہتیں ''شبنم تم اپنا پڑھنا پڑھانا کر لو، پھر رات کو فرید بھائی لوگ آئیں گے تو محفل جمے گی۔''

فرید بھائی مطالعہ کا شوق رکھتے تھے۔ وہ کبھی کوئی کتاب شبنم سے عاریتاً لے جاتے اور جب واپس لاتے تو اس پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ اِس دوران میں زینت بھابھی خاموشی سے اِن کی طرف دیکھتی رہتیں۔ کیوں کہ یہ گفتگو اُن کے سَر سے اُوپر ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر گزر جاتی لیکن وہ کبھی اُکتاہٹ کا اظہار نہ کرتیں۔

ایک روز جب زینت بھابھی کچن میں اپّی کی مدد کروا رہی تھیں۔ تو فرید بھائی نے شبنم سے کہا۔

''شبنم تمہاری مدد چاہیے۔''

''کس سلسلے میں فرید بھائی؟ میں حاضر ہوں۔''

''ذرا زینت کو پہننے اوڑھنے کے طور طریقے سمجھا دو میں تو بہتیری کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن وہ تو ہیر پھیر کر ویسی کی ویسی ہو جاتی ہے۔''

شبنم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اِس کا کیا جواب دے کہ اتنے میں اپّی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کھانا لگنے کی نوید سنائی۔

کھانے کی میز پر فرید بھائی نے اپّی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''عنیزہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے میں تو تین ماہ کے بعد پھول کے کپا ہو جاؤں گا اور میری A.C.R متاثر ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم مزے مزے کے کھانے بنانا چھوڑ دو اسی طرح پکاتی رہو۔ بلکہ ہم شام کو جلدی آ جایا کریں گے تم زینت کو اپنی شاگردی میں لے لو۔ یہ پکاتی تو بہت اچھا ہے لیکن ذرا ورائٹی آنی چاہیے۔''

اپّی نے مسکرا کر زینت بھابھی کی طرف دیکھا جو اِس بات پر خوش نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد فرید بھائی نے شبنم سے کہا۔

''شبنم کل شام کو میں تمہیں عنیزہ اور زینت کو بازار لے چلوں گا۔ زینت کو تھوڑی شاپنگ کرنا ہے۔''

پھر معنی خیز انداز میں شبنم کی طرف دیکھا اُس نے فرید بھائی کی طرف دیکھا اور ذرا سا جھک کر اثبات میں سر ہلایا۔

''شاپنگ زینت کو کرنا ہے۔ میں اور شبنم ساتھ جائیں گے پھر۔۔۔؟؟''

اپّی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''چلو تم دونوں بھی میری طرف سے ایک ایک سوٹ خرید لینا میں اپنی بیگم کے لیے 'کچھ' بھی کر سکتا ہوں۔''

''تھری چیرز فور فرید بھائی دا گریٹ ہپ ہپ ہرّے۔''

شبنم نے نعرہ لگایا۔

ایک روز بھائی جان بہت خوش خوش آفس سے گھر واپس آئے اور بتایا۔

''فرید کا فون آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بیٹے سے نوازا ہے۔ بہت خوش تھا لیکن جلدی میں تھا بتا رہا تھا کہ زینت کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں پھر تفصیلاً بات کرے گا۔''

زینت بھابھی کی طبیعت دو تین روز بہت خراب رہی پھر وہ ٹھیک ہو کر گھر آ گئیں۔ تو اِن سب نے رسالپور جانے کا پروگرام بنایا۔ شبنم اور اپّی نے بچے کے لیے بہت سی شاپنگ کی اور ایک سوٹ زینت بھابھی کے لیے لیا۔

فرید بھائی اور زینت بھابھی نے اُن کا بہت محبت سے استقبال کیا، لیکن زینت بھابھی کو دیکھ کر انھیں بہت مایوسی ہوئی کہ بقول فرید بھائی وہ ہر پھر کر وہیں واپس آ گئی تھیں۔ بچے کی پیدائش کی وجہ سے وہ پہلے سے بھی زیادہ لحیم شحیم ہو گئی تھیں۔ عجیب و غریب

رنگوں والا سوٹ۔ (جسے شبنم تنجن کہا کرتی تھی) پہن رکھا تھا۔ جو مزید سانولا ہو جانے والے چہرے پر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اُن سے مسلسل دیسی گھی کی مہک آ رہی تھی۔ فرید بھائی نے زینت بھابھی کی طبیعت کے پیشِ نظر بیٹ مین سے کہہ کر کھانا بیڈروم میں ہی لگوایا۔ جو انھوں نے میس سے آرڈر پر منگوایا تھا۔

زینت بھابھی بیڈ کے ہیڈ بورڈ کے ساتھ تکیے رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں تو فرید بھائی نے اُن کے پاس بیٹھ کر انھیں اپنے ہاتھ سے سوپ پلایا۔ شبنم نے کہا۔

''لائیے بھائی یہ کام میں کرتی ہوں آپ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیے۔''

''نہیں شبنم۔۔۔ آج کل میں ایئر فورس کی بجائے بیگم کی نوکری کر رہا ہوں اور تم جانتی ہو میں اپنی ڈیوٹی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔''

واپسی پر شبنم اور اپّی دونوں زینت بھابھی کے 'حالات' اور فرید بھائی کی 'خدمات' کا ذِکر کر کے ہنس دیئے۔ بھائی جان کہنے لگے۔

''اِسے کہتے ہیں،

'سے کوجیاں لنگھ پار گئیاں

ایتھے روندیاں شکلاں والیاں نے'

اپّی نے وضاحت کی یعنی رُوپ روئیں اور کرم کھائیں۔ شبنم نے کہا ''بھائی جان آج کل اِس نے یہ شکل اختیار کر لی ہے۔''

'ڈیانا روئے اور کمیلا پار کر کھائے'

بھائی جان نے مسمسی شکل بنا کر شبنم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو فرید اور زینت کو ملنے سے خوف آتا رہتا ہے۔ کیوں کہ ان سے ملاقات کے بعد عنیزہ مجھ میں بہت کیڑے نکالتی ہے۔''

''توبہ ہے۔۔۔ خدا کا کچھ تو خوف کریں میں نے کبھی کچھ کہا بھی ہے۔''

اپّی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

شبنم نے I. Com کرنے کے لیے داخلہ لے لیا فرید بھائی کی ٹرانسفر کراچی ہو گئی۔ اب فون پر اُن سے رابطہ رہتا۔ وہ سکوارڈن لیڈر ہو گئے تھے۔ اُن کا بیٹا جمال اب دو سال کا تھا۔

ایک روز شام کو فرید بھائی تھوڑی دیر کے لیے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لیے صبح آئے تھے اور اب آدھ گھنٹے کے بعد C-130 جہاز پر واپس چلے جائیں گے۔

شبنم دوپہر کو کالج سے آ کر تھکی ہاری سو گئی تھی۔ اپّی نے اُسے جگایا کہ وہ فرید بھائی سے مِل لے۔ شبنم نیم خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ ننگے پاؤں چلی آئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ فرید بھائی ٹھٹک سے گئے۔ اُن کی کنپٹی پر تھوڑے تھوڑے سفید بال نظر آ رہے تھے اور وہ یونیفارم میں پہلے سے بہت زیادہ گریس فل لگ رہے تھے۔

بھائی جان ابھی آفس میں ہی تھے۔ فرید بھائی تھوڑی دیر کے بعد اُن سے ملے بغیر ہی واپس چلے گئے۔ کیوں کہ اُن کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد اپّی نے شبنم کو بتایا کہ فرید بھائی تھوڑے بجھے بجھے سے تھے۔ کیوں کہ جمال کی پیدائش کے دوران کچھ ایسی پیچیدگی واقع ہو گئی تھی کہ ڈاکٹرز نے کہہ دیا تھا کہ زینت بھابھی دوبارہ ماں نہ بن سکیں گی۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ زینت سے انھوں نے یہ بات چھپائی ہوئی ہے تا کہ اسے پریشانی نہ ہو۔

''واقعی فرید زینت کا بہت خیال رکھتا ہے۔'' اپّی نے کہا۔

بھائی جان کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے ایک ہفتے کے لیے کراچی

جانا تھا۔ کمپنی کی طرف سے انھیں اور ان کی فیملی کو جہاز کا کرایہ اور فائیو سٹار ہوٹل میں رہائش
مل رہی تھی۔ اپّی اور بچوں کے اصرار پر شبنم بھی کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر ساتھ جا
رہی تھی۔ حالانکہ BBA کے دوران اس کے لیے چھٹی کرنا بہت مشکل تھا۔

پہلے ہی روز شام کو یہ لوگ فرید کے ہاں چلے گئے۔

فرید بھائی ہمیشہ کی طرح سمارٹ اور تروتازہ لگ رہے تھے۔ جب کہ زینت
بھابھی، جمال کی پیدائش کے بعد، جو اب چار سال کا ہو چکا تھا اکثر بیمار رہنے لگی تھیں۔ بیٹھے
رہنے سے وہ اور موٹی اور بھدّی ہو گئی تھیں۔ چہرے پر جو تھوڑی بہت رونق تھی۔ وہ بھی اڑنچھو
ہو چکی تھی۔ تھوڑی سی بات کرتیں تو ان کا سانس پھولنے لگتا۔

رات کے کھانے کے لیے فرید بھائی انھیں میس لے گئے۔ خوب روشن اور سرسبز
لان اور کراچی کی حسین شام۔۔۔ انھوں نے Bar.B.Q کا لطف اُٹھایا۔ ایئر فورس کے
افسران کی بیگمات بے انتہا فیشن ایبل اور موڈرن تھیں۔ ان کے درمیان بیٹھی زینت
بھابھی، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ رہی تھیں۔۔۔ لیکن پر اعتماد۔۔۔ جو کہ یقیناً فرید بھائی نے
انھیں بخشا تھا۔

کھانے کے بعد یہ لوگ اپنے ہوٹل کے لیے روانہ ہونے لگے۔ فرید بھائی نے
زینت بھابھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپّی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"عنیزہ۔۔۔ اپنی بھابھی سے کہو کہ یہ جو اتنی بیماریاں ساتھ لیے پھرتی ہیں، ان
سے ایک ہی بار میں فارغ کیوں نہیں ہو جاتیں، تاکہ میں بھی آزاد ہو کر دوسری شادی کا سوچوں۔"

وہ ایسے مذاق اکثر کیا کرتے تھے۔

زینت بھابھی نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"عنیزہ اپنے بھائی سے کہو کہ فارغ تو مجھے ایک دن ہونا ہی ہے۔ لیکن یہ تب ہو گا
جب انھیں کوئی 'اور' ملنے کا وقت باقی نہیں رہے گا۔"

زینت اور شبنم دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔

"عنیزہ، اپنی بھابھی سے کہو کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔"

فرید بھائی اس طرح زینت بھابھی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔

"عنیزہ اپنے بھائی سے کہو کہ یہ ہرگز زیادتی نہیں ہے۔ آخر کو میں اپنی مرضی کی
آپ مالک ہوں۔"

کراچی سے فرید بھائی کا فون آیا کہ وہ پروموٹ ہو کر ونگ کمانڈر بن گئے ہیں
اور تین سال کے لیے سعودیہ جا رہے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان لوگوں
سے ملنے آتے۔ بھائی جان نے کہا اگر تم جانے کے کاموں میں مصروف ہو تو ہم لوگ آ
جاتے ہیں لیکن وہ اتنی ہبڑ دبڑ میں جا رہے تھے کہ انھوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ آپ اب
سعودیہ آئیں اور ان کے ہاں ٹھہریں۔

فرید بھائی کے قریبی رشتہ دار تو پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اِس لیے ان کے ساتھ تو
ان کا ملنا جلنا ہی تھا لیکن بھائی جان کی تعلیم اور اچھی عادات کی وجہ سے عنیزہ سے بہت قریبی
رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی تعلق بہت گہرا ہو گیا تھا۔

شبنم کا ایم۔ بی۔ اے مکمل ہوا تو اسے فوراً ہی ایک غیر ملکی بینک میں CBG
ڈیپارٹمنٹ میں اچھی جاب مل گئی۔ اب وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ بھابھی شکایت ہی
کرتی رہتیں کہ:

"چھوڑو جاب، تم تو گئیں کام سے اب تو نہ بیٹھ کر گپیں لگا سکتی ہیں اور نہ ہی
شاپنگ پہ جا سکتی ہیں۔"

"نہیں اپّی مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔"

"یہ اچھی رہی کیریئر بنانا ہے۔۔۔ میں تمہارے بھائی سے کہتی ہوں اگر تمہیں ہم
لوگوں سے کٹ کر ہی رہنا ہے تو کیوں نہ تمہیں رُخصت کر دیں۔"

نہ جانے انھوں نے کونسی قبولیت کی گھڑی میں یہ بات کی تھی کہ عاطف کا رِشتہ آیا جو تھوڑی سی جانچ پڑتال کے بعد قبول کرلیا گیا۔

اپّی نے بہت محبت سے اس کے جہیز کی تیاری کی۔ وہ خود تو شام کو تھکی ہاری لوٹتی اور اپّی اس کی مند ہوتی ہوئی آنکھوں کے سامنے اس کی چیزیں رکھ رکھ کر ڈانٹ ڈانٹ کر اسے دِکھاتیں۔ اس ڈانٹ میں چھپے پیار کو جان کر شبنم اکثر جذباتی ہو جاتی۔ حالانکہ پہلے اس نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ اپّی اس کے ماتھے پر پیار کرتیں اور کہتیں۔

''تم کسی چیز کو لینے کی خواہش کا اظہار نہیں کرتیں۔ ٹھیک ہے میں اماں کی جگہ تو نہیں لے سکتی پھر بھی۔۔۔''

ان کی بات منہ میں ہی رہ جاتی جب شبنم اِن کے گلے سے چپک کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگتی تو اپّی کو اپنی بات کا جواب مِل جاتا۔

''اپّی میں اتنی بڑی تھی کہ اماں کا واضح عکس میرے سامنے ہے لیکن میں جب ان کا تصوّر کرتی ہوں تو آپ میرے سامنے آجاتی ہیں۔''

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور فرید بھائی اور زینت بھابھی کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے تفصیلاً فون پر بتایا کہ زینت کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اِس لیے وہ لوگ نہیں آ پائیں گے۔ جس کا انھیں ہمیشہ ملال رہے گا۔ جمال اب آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ وہ آنے کے لیے بہت بے چین تھا اس لیے وہ اسے اکیلا بائی ایئر بھیج رہے تھے۔

ان سب کو بھی فرید بھائی اور بھابھی زینت کے نہ آنے کا افسوس ضرور تھا لیکن اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ جمال شادی میں شرکت کرے گا۔

شادی سے تین روز پہلے جمال پہنچ گیا۔ اس کے چچا چچی بھی شادی میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔ اس لیے اس نے آتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ پورا ایک ہفتہ اِدھر ہی گزارے گا۔ زینت بھابھی نے اس کے ہاتھ ایک بہت خوبصورت سوٹ اور نازک سا

گولڈ کا سیٹ بھیجا تھا۔ جمال نے بتایا کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے بابا اپنی پسند سے لے کر آئے تھے۔ (شبنم اور عنیزہ نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ زینت بھابھی کی پسند نہیں ہے۔)

جمال نے بتایا کہ یہ تحفہ اماں نے بھیجا ہے۔ بابا کہہ رہے تھے وہ سرپرائز گفٹ بھیجیں گے۔

شادی سے ایک روز پہلے کوریئر سے ایک بہت بڑا پیکٹ سعودیہ سے آیا۔ عنیزہ اور شبنم نے بے تابی سے کھولا تو اس میں yardley کے Damask Rose کا مکمل میک اوور سیٹ تھا۔ اتنی خوبصورت پیکنگ تھی کہ شبنم کہنے لگی۔

''اپّی میرا حوصلہ ہی نہیں ہوگا اس کی پیکنگ کو چھونے کا۔''

ساتھ میں دو بہت قیمتی فرنچ پرفیومز تھیں اور عاطف کے لیے شاندار شیونگ کٹ۔''

شبنم نے اسی وقت کال کر کے فرید بھائی اور زینت بھابھی کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔ نصیبوں کی بھی شاید بندر بانٹ ہوتی ہے۔ کسی ایک کا پلڑا بھاری اور دوسرے کا پلڑا ہلکا۔ شبنم محبت کے معاملے میں بہت خوش قسمت تھی۔ والدین کے علاوہ بھائی بھابھی کی محبت تو ملی ہی تھی۔ سسرال میں جیسے اس کی ساس، جنھیں وہ 'ماں جی' کہتی تھی، اس سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ کیا کسی ساس نے اپنی بہو سے کیا ہوگا۔ عاطف انتہائی ملائم مسکراہٹ والا اتنا خیال رکھنے والا شوہر تھا کہ شبنم کو بعض اوقات یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے اچھے لوگ اس کی زندگی میں موجود ہیں۔

شادی کے تین ماہ بعد فرید بھائی کا فون آیا۔

''شبنم تم سعودیہ کب آرہی ہو؟''

''بھائی آپ سے کس نے کہا کہ میں آرہی ہوں۔''

''وہ اِس لیے کہ تمہارا ٹکٹ میرے ذمہ ہے۔ جب کہو گی سیٹ اوکے کروادوں

گا۔تم کہو گی تو تمہارے بندر کو بھی ٹکٹ بھیج دوں گا۔ فرید بھائی ہمیشہ عاطف کو یہی کہہ کر بلاتے۔ اس پر شبنم احتجاج کرتی۔ ''بھائی ایسے تو نہ کہیں۔ اتنے ہینڈسم تو ہیں عاطف۔''

''بھائی ٹکٹ تو آپ بھیج دیں گے لیکن میں شاپنگ کیسے کروں گی؟ عاطف کہیں گے کہ جس نے ٹکٹ بھیجا ہے اُسے کہو شاپنگ بھی کروادے۔''

شبنم نے لہجہ ایسے بنالیا جیسے ابھی رو دے گی۔

''وہ بھی کروادوں گا۔ لیکن یہ رقم ادھار ہوگی۔۔۔ تم واپس بھیجنا نہ کرنا۔ بس کہتی رہنا۔'' بھائی میں جلد ادا کردوں گی۔ مجھے حوصلہ رہے آس نہ ٹوٹے۔''

''یہ تو بہت آسان نسخہ ہے۔ سمجھنے میں پہنچی کہ پہنچی لیکن یہ سب مذاق کی حد تک تھا۔ فرید بھائی اور زینت بھابھی نے بہت دفعہ کہا لیکن شبنم کے ہاتھ میں بیرونِ ملک سفر کی لکیر ہی نہیں تھی شاید۔ اور پھر وہ لوگ واپس پاکستان آگئے۔

☆☆☆

شبنم ابھی خیالات میں گم تھی کہ فلائنگ کوچ آہستہ ہوئی اور پھر رُک گئی۔ ڈرائیور نے Toll Tax ادا کیا اور کوچ موٹر وے سے اُتر کر شہر کی طرف بڑھنے لگی۔ لاہور، ملک کا دوسرا بڑا شہر ہونے کے باوجود یوں محسوس ہوا جیسے شاہراہِ جنت اب راہِ دوزخ میں تبدیل ہو گئی ہو۔ اور جب کوچ سے اُتر کر رکشہ میں بیٹھی تو گرم ہوا اور جھٹکوں نے حساب برابر کردیا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع بھائی جان یا اپّی کو نہیں دی تھی۔ ورنہ اپّی ضرور پہنچی ہوتیں۔ لیکن شبنم نے سوچا تھا وہ کہاں اتنی گرمی میں خود ڈرائیو کرتی ہوئی آئیں گی۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح بغیر اطلاع کیے آنے پر بھی اسے ڈانٹ پڑنے والی تھی۔

بھائی جان ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔ بچے ٹیوٹر سے پڑھ رہے تھے۔ سلام دُعا پیار کے ساتھ ساتھ بغیر اطلاع کے آنے پر لعنت ملامت سے فارغ ہوکر شبنم اور اپّی بیڈ روم میں آبیٹھیں۔ بانو چائے لے آئی تو اچانک شبنم نے پوچھا۔

''اپّی، فرید بھائی کیسے ہیں؟''

اپّی کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا، پھر انھوں نے لاتعلقی سے کہا۔

''ٹھیک ہی ہوگا۔ کیونکہ میرا اس سے رابطہ نہیں ہے ایک ماہ سے۔''

''کیوں؟''

''بس یونہی۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے ہی کال نہیں کیا۔''

اپّی کچھ سٹپٹا سی گئیں۔

''میرا بھی ان سے رابطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔''

''کیا؟۔۔۔ کیوں؟''

''اپّی بتاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ ایک نامعلوم نمبر سے مجھ سے موبائل پر عجیب وغریب باتیں۔۔۔''

''یعنی تمہارے ساتھ بھی؟''

اپّی نے بوکھلا کر کہا۔

''یہ 'بھی'؟۔۔۔ کیا مطلب؟ انھوں نے آپ سے بھی کچھ کہا؟''

''ہاں۔۔۔ بہت کچھ اُوٹ پٹانگ۔۔۔ میں تو دل ہی دل میں شرمندہ تھی کہ تمہارے بھائی یا تم سنو گی تو میرے بارے میں یا اس کے بارے میں کیا سوچو گی؟ آخر وہ ہے تو وہ میرا ہی کزن نا!''

''پچھلی بار جب میں آئی تو آپ کچھ پریشان سی دِکھ رہی تھیں۔ اسی لیے؟''

''ہاں'' اپّی نے مختصر جواب دیا۔

''انھوں نے تو کیا سو کیا لیکن آپ نے یہ کیا سوچ لیا کہ میں اور بھائی جان کیا تاثر لیں گے۔۔۔ ایسا ہوسکتا ہے بھلا؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ عاطف بہت اچھا ہے لیکن کیا تم نے اسے بتایا؟ نہیں نا!''

”نہیں اپّی اس طرح تو میرا ماضی ہی مشکوک ہو جاتا۔۔۔“

”بس اسی لیے تو مجھے آپ لوگوں سے کہتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ عورت کتنی بھی اچھی ہو۔ وہ ’کردار کی غازی‘ ہو اور ’بے داغ‘ ماضی رکھتی ہو پھر بھی۔۔۔“

اپّی نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

”آپ بتائیں تو سہی انھوں نے کیا کہا؟“ شبنم نے بے تابی سے پوچھا۔

”یہی کہ میری آنکھ بہت دیر بعد کھلی۔ میرا دھیان جب تمھاری طرف گیا تو تم میری شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اپنے شوہر کے ساتھ۔۔۔ میں بہت پچھتا تا رہا لیکن کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بس تم ایک بار کہہ دو کہ تمھیں بھی مجھے دیکھ کر یہی احساس ہوا تھا تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی اکارت نہیں گئی۔ بس ایک ILU (I Love U) کا sms بھیج دو۔ پھر اس کے بعد میں۔۔۔ میں تم سے کچھ اور طلب نہیں کروں گا۔“

میں نے پھر بے نقط سنائیں کہ اور کیا تقاضہ کرنا چاہتے ہو؟ کرو۔۔۔ اس کا جواب تمھیں میرے میاں دیں گے۔۔۔ تم پاگل ہو گئے ہو، یا۔۔۔ اب میں کیا کہتی بول بک کر فون بند کر دیا۔ لیکن اس کے بعد شکر ہے اس نے مجھے دوبارہ کال نہیں کیا۔۔۔ میرا خیال ہے اتنی سمجھ تو اس میں ہے جس کا مظاہرہ اس نے دوبارہ فون کر کے نہیں کیا۔“ اپّی نے بات ختم کی اور پھر بے تابی سے پوچھنے لگیں۔

”تم سے کیا کہا اس بدتمیز نے؟“

”پچھلے ماہ میں بینک سے واپس آ رہی تھی اور سگنل پر رکی تو ایک نامعمول نمبر سے sms تھا۔ میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میرا خیال ہے آپ سے رابطہ ختم ہونے کے اگلے ہی روز کی بات ہو گی میں نے گھر جا کر دیکھا تو فیضؔ کا قطعہ تھا:

ؔ ’رات یوں دِل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے‘

میں نے پروا نہیں کی کہ غلطی سے کسی نے اس نمبر پر بھیج دیا ہو گا اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ نوٹس لیا جاتا۔ اگلے روز پھر اسی نمبر سے اِسی وقت فون مِلا۔ اب بھی فیضؔ کا ہی شعر تھا:

ؔ سوزش دردِ دِل کسے معلوم
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میں نے پھر کوئی نوٹس نہیں لیا۔

لیکن پھر تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہر sms میں سے محبت کا شیرہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہوتا لیکن کبھی ان میں لچر پن یا بدتمیزی کا شائبہ نہ پایا جاتا ہر شعر محبت بھرا اور ہر qoutation جدائی کے لمحوں کی داستان۔۔۔

میں نے اپنی دوستوں سے ذکر کیا تو لیلیٰ نے جھٹ سے میرے ہاتھ سے موبائل لیا اور جوابی sms لکھا۔

”او بھئی کیہڑا اے؟“

میں نے بمشکل اسے send کرنے سے روکا۔

میں اس شخص کو بے تکلفی کی ڈھیل دے کر بڑھاوا نہیں دینا چاہتی تھی۔

اگلے روز sms تھا۔

ؔ چند کلیاں نشاط کی چن کر
مُدّتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تم سے ملنا خوشی کی بات سہی
تم سے مِل کر اُداس رہتا ہوں

اگلے روز:

میری محبتوں کا پیغام
تیرے حسن کے نام

اور پھر یہ پیغام ملا کہ Send me three letter sms ILU

اب تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے سوچا وہ تو میں بہت آسانی سے کر سکتی ہوں۔ د۔ ف۔ ع تین حرف بھیجنا تو بہت آسان ہے۔''

میں نمبر بلاک کروانے کا سوچ رہی تھی کہ لیلیٰ اور فریسہ نے مجھے مجبور کیا کہ آج پہلے تم اس سے بات کرو۔۔۔ خوب سناؤ۔۔۔ پھر نمبر بلاک کروا دینا۔

لیلیٰ نے کہا ''اگر تم میں ہمت نہیں ہے تو میں گالیاں دینے میں مہارت کا درجہ رکھتی ہوں مجھے نمبر دو۔''

اس روز ہمارا بریک ٹائم ختم ہو گیا اور میں فون نہ کر پائی۔ اچھا ہی ہوا ورنہ جتنے قصے میں فرید بھائی کے ان لوگوں کو سنا چکی تھی وہ سب جھوٹ بن جاتے اور لیلیٰ کہتی۔

''میں پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کے پاس ایک ہزار جھوٹی کہانیاں ہیں۔''

گھر پہنچی تو عاطف، اماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ گھر پر صرف بچے اور نصیبن تھی۔ میں نے نمبر ملایا تو مجھ پر فرید بھائی کی آواز بجلی بن کر گری۔ ایک لمحے کے لیے تو میں حواس باختہ ہو گئی۔

پھر میں نے سوچا یہ فرید بھائی بھی نا بس۔۔۔ مذاق کی عادت تو انھیں ہمیشہ سے ہے لیکن اس حد تک۔۔۔

اور جب ادھر سے جواب آیا۔

''آخر تم میری بات سمجھ ہی گئیں، مجھے یقین تھا۔ میری محبت میں اتنی طاقت ہے۔''

میں نے کہا:

''مذاق چھوڑیں فرید بھائی۔۔۔ صرف فیض سے ہی فیض یاب نہ ہوں۔ جمیل الدین عالی کو بھی سن لیں۔ موصوف فرماتے ہیں:

ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر
بھیّا کہہ گئی نار۔۔۔

''شبنم میں سنجیدہ ہوں۔''

''اگر نہیں بھی ہیں تو اب ہو جائیں۔ یہ آپ کے لیے بھی اچھا ہے اور ہم سب کے لیے بھی۔''

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتے۔ میں نے کہا ''فرید بھائی کیا غضب ہے کہ آپ اپنی اور میری۔۔۔''

کہنے لگے۔

''تم عمر کی بات کر رہی ہو نا!۔۔۔

کیا غضب ہے کہ ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

انھیں نکال دو تو۔۔۔''

''میرے پاس کوئی ٹائم مشین نہیں ہے۔ فرید بھائی جو میں عمر کو جمع نفی کر کے دیکھ سکوں۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے یہ کمبخت عشق۔۔۔''

''ایسی کی تیسی اس بے وقتے عشق کی۔ میں بہت سخت سست کہہ سکتی ہوں۔ لیکن آپ کا احترام مانع ہے۔ جو میں نے ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اور کچھ غلط نہیں کیا، لیکن آپ اب مجھے یہ بات کہہ رہے ہیں جب کہ اس ممکن کو ناممکن بنے مدّتیں گزر گئیں۔

کتنا اچھا ہوتا میں بھی ایئر کموڈور کی بیوی ہوتی۔ بیس کمانڈر کی بیوی۔۔۔ ورلڈ

ٹور پر جاتی، آپ کے جونیئر افسران کی بیویاں اپنے شوہروں کی نوکری سیدھی کرنے کے لیے میری خوشامد کر کر کے بے حال ہوتی رہتی۔ میرے پاس مہنگے پرفیومز اور کرسٹل کی بھرمار ہوتی۔ کہیں جاتی تو اسکارٹ ساتھ ہوتا۔ گلوز چڑھائے بٹلر میرے سامنے مختلف ڈشز رکھتا۔ میں جی بھر کے حج اور بے شمار عمرے کرتی۔ لیکن اب سب بے سود ہے۔''

اپّی نے پہلی بار دخل اندازی کی۔

''شبنم تم نے ایسا کیوں کہا؟ عاطف بہت اچھا ہے۔''

''وہ بہت اچھے ہیں لیکن یہ سب تو میں فرید بھائی کا پچھتاوا بڑھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اب باقی کی عمر اسی تصوّر کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ اتنا حق تو مجھے حاصل ہے نا!''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' وہ اب بھی باز نہیں آئے تھے۔ فرمایا:

ے مُدّت گزر گئی ہے۔ یہ عالم ہے مستقل
کوئی سبب نہیں ہے مگر دِل اُداس ہے''

میں نے کہا'' آپ یہ بات اِس وقت کہتے جب یہ بات بے وقت محسوس نہ ہوتی۔

ساحر لدھیانوی نے آپ کے لیے ہی کہا ہے:

ے تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کرلو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

لیکن آپ میں ہمت نہ تھی۔

میرا خیال ہے وہ سمجھ گئے کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔''

اسی وقت ان کا آخری sms آیا۔

ساحر لدھیانوی کا ہی شعر:

ے 'لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی کسی سے گلہ نہ کریں گے ہم'

اسی روز سے میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ اگر میں آپ سے نہ کہتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی۔''

زینت بھابھی اپنی بیماری سے خائف رہتی تھیں۔ اِس لیے انھوں نے جمال کی شادی جلد ہی کر دی تھی۔

اور ادھر ایئر کموڈور (R) فرید احمد تھکے قدموں سے اپنے بیڈ روم میں آئے تو ان کا پوتا بھاگتا ہوا آیا۔ اور ان سے پہلے اُن کے بستر میں لیٹ گیا اور چلّایا۔

''دادا، کہانی سنائیں۔''

''یار تم عجیب آدمی ہو۔ اِس زمانے میں بھی دادا سے کہانی سنتے ہو۔ آج کل تو بچے، ٹی وی اور کمپیوٹر کے گرد ہی گھومتے رہتے ہیں۔۔۔ دادا سے کہانی کون سنتا ہے بھلا؟''

فرید احمد نے پوتے کو دُلار سے کہا۔ اُسے روزانہ کہانی سنانے سے پہلے۔ وہ یہ بات ضرور کرتے تھے۔ جب ذیشان، دادا کے بازو پر سر رکھ کر آرام سے لیٹ گیا اور انھوں نے اپنا کمبل پھیلا کر اُسے بھی اس میں چھپا لیا۔ تو کہانی شروع ہوئی۔

''بیٹا ایک کوا تھا۔ وہ بہت پیاسا تھا۔ وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر اُڑتا رہا۔ لیکن اُسے کہیں پانی نظر نہ آیا۔ اُس کی پیاس پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرنے سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اُڑتے اُڑتے اُسے ایک گھر کی دیوار پر رکھا ہوا مٹکا نظر آیا وہ بہت خوش ہوا لیکن اُس کی خوشی جلد ہی پریشانی میں بدل گئی جب اُس نے دیکھا کہ تھوڑا سا پانی تو تہہ میں موجود ہے لیکن باقی مٹکا خالی ہے۔ وہ بہت گھبرایا۔ اُس کا حلق پیاس کے مارے سوکھ رہا تھا۔ اور پانی تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔''

''ہوں۔۔۔ کوّے بیچارے کوئی ڈرنک بھی تو نہیں لیتے نا!''

ذیشان واقعی پروین شاکر کے ''ہمارے عہد کے بچوں جیسا'' چالاک نہیں تھا، نے بھول پن سے کہا۔

”کوا بیچارا سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے آخر اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اُس نے اِدھر اُدھر سے کنکریاں جمع کر کے مٹکے میں ڈالنی شروع کر دیں وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کرنے سے پانی کی سطح بلند ہو جائے گی اور وہ اُسے آسانی سے پی لے گا۔“

”wow---w-w“ ذیشان چلّایا۔

”کوا دُور دُور تک اُڑتا رہا اور کنکریاں تلاش کر کے لاتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ پانی کی سطح اُونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اب اُسے منزل قریب نظر آ رہی تھی۔ بس ایک آدھ کنکری اور چاہیے تھی اور جب وہ دُور دُور تک تلاش کے بعد آخری کنکری لے کر واپس آیا تو اُس کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ پہلی کنکریوں نے مٹکے کا پانی چوس لیا تھا اور اب اُس میں ایک قطرہ بھی باقی نہیں تھا۔“

”نہیں دادا۔۔۔ یہ کہانی ایسے نہیں ہے۔ میری ٹیچر نے یہ کہانی مجھے سنائی تھی۔ ہوتا یوں ہے۔۔۔“

”نہیں بیٹا۔“ فرید احمد نے آہستگی سے کہا ”یہ کہانی ایسے ہی ہے۔ دراصل کوّے نے بہت دیر کر دی تھی۔“

□□□

ٹرنک

”ابا نے آخر اس میں کیا بند کر رکھا ہے؟ مجال ہے جو کبھی ہمیں خبر ہونے دیں۔“ پندرہ سالہ کبیر نے جھنجھلا کر کہا۔

”جتنا جتنا وہ اسے چھپا کر رکھتے ہیں۔ اتنا اتنا میرا تجسس بڑھتا جا رہا ہے۔ گھر کی ہر چیز کُھلی پڑی ہے۔ سوائے اس ٹرنک کے۔“ کبیر سے چھوٹے تیرہ سالہ انصر نے خفگی ظاہر کی۔

”بھائی، اس کے اندر امّاں کے زیورات ہوں گے۔ میرا دِل کہتا ہے۔“ لڑکی ہونے کے ناتے گیارہ سالہ راشدہ کی سوچ زیورات میں اٹکی ہوئی تھی۔

”لو کر لو بات۔۔۔ زیورات ایسے تھوڑی رکھے جاتے ہیں۔ چاہے کوئی اس ٹرنک سمیت زیورات اُڑا لے جائے۔“ انصر نے حسبِ عادت نفی کی اور سر کو جھٹکا دیا۔

”میرا خیال ہے اس میں امّاں کی تصویریں اور ان کے خط ہوں گے۔“ کبیر جو جوانی میں قدم رکھ رہا تھا، نے کہانی میں رُومانیت کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

”لیکن بھائی، امّاں کی تصویر تو ابا نے اپنے سرہانے دیوار پر لگا رکھی ہے۔ انھیں تالے میں بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور امّاں ابا تو ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ امّاں نے

خط کیوں لکھے ہوں گے ابا کو؟'' راشدہ نے بہت عقلمندانہ وضاحت کی۔

''بے وقوف۔۔۔امّاں نے شادی سے پہلے ابا کو جو خط لکھے ہوں گے وہ ابا نے سنبھال رکھے ہوں گے۔'' کبیر بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

لیکن جب ڈیوڑھی میں ابا کے سائیکل کھڑا ہونے کی آواز آئی تو تینوں یوں اِدھر اُدھر ہو گئے جیسے ٹرنک کبھی ان کے زیرِ بحث رہا ہی نہ ہو۔

عبدالصمد، سبزی اور سودا سلف کا تھیلا لے کر سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک انڈا تھا۔

''السلام علیکم ابا۔ پانچ انڈے تو ابھی گھر میں پڑے تھے۔ آپ اور لے آئے، اور وہ بھی ایک ہی۔'' راشدہ نے ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اطلاع دی۔

''ہوں۔۔۔دوں۔۔۔دل۔'' ابا نے ہنکارا بھرا۔ تھوڑی دیر کے بعد راشدہ کچن میں گئی تو وہی پانچ کے پانچ انڈے تھے۔ چھٹا غائب تھا۔

''تو کیا ابا کچا انڈا نگل گئے؟''

راشدہ کا بچپن کھلکھلایا۔

عبدالصمد کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے کبیر اور انصر اور ایک بیٹی راشدہ۔ اس کی بیوی نسرین، سلجھی ہوئی، سلیقہ مند اور صلح جو عورت تھی۔ دونوں کی زندگی، ایک دوسرے کے ساتھ میں، بہت اچھی گزر رہی تھی کہ شہر میں ہیضہ کی وبا پھوٹی۔ راشدہ اور اس کی ماں بھی اس کی زد میں آ گئیں۔ راشدہ تو لوٹ پوٹ ہو کر ٹھیک ہو گئی لیکن نسرین، چھ سالہ بیٹی اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر راہیِ مِلکِ عدم ہوئی۔

ہنستے بستے گھرانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ جب نسرین رُخصت ہوئی تو عبدالصمد کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی ذمہ داریاں، اپنے سر لیے ہوئے تھی۔ عورت کہنے کو تو صنفِ نازک ہے لیکن شوہر کی غیر موجودگی میں بُرا بھلا کما بھی لیتی ہے اور ساتھ ساتھ گھر بھی سنبھال لیتی

ہے۔ لیکن مرد کے لیے گھر سنبھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عبدالصمد کو بھی ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کے والدین تو حیات نہیں تھے۔ ایک بیوہ پھوپھی اپنی بیٹی کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ داماد خاصہ بد اخلاق تھا۔ اس لیے وہ بخوشی عبدالصمد کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئیں۔ یوں بھی وہ ان کے بھائی کا بیٹا تھا وہ یہاں زیادہ مان کے ساتھ رہ سکتی تھیں۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھیں۔ زیادہ کام وام تو نہیں کر سکتی تھیں اس لیے عبدالصمد کام سے واپس آ کر اُلٹی سیدھی ہنڈیا بنا لیتا۔ پھوپھی امّاں روٹیاں تھوپ دیتیں۔ بچے بھی ماں کے بغیر جلد سیانے ہو گئے تھے۔ اس لیے جیسے تیسے گھر کی گاڑی رینگنے لگی۔

عبدالصمد، بچوں کا بہت خیال رکھتا لیکن کبھی کبھار اسے چپ لگ جاتی۔ گہری سوچ میں ڈوبا رہتا جیسے اندر ہی اندر کوئی جنگ لڑ رہا ہو۔ پھوپھی امّاں بچوں کو سمجھاتیں۔

''بیٹا، زندگی کا ساتھی جدا ہو جائے تو دِل پر ویرانی چھا جاتی ہے۔ جب تمہارے پھوپھا ابا گزر گئے تھے تو میں کئی برسوں تک اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ تم لوگ پریشان نہ ہوا کرو۔ آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔''

عبدالصمد، رات کو بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے، ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا۔ ان کے مسائل پر بات کرتا۔ ان کی تعلیمی صورتِ حال جاننے کی کوشش کرتا۔ مشورے دیتا۔ لیکن اس نے کبھی اس ٹرنک کے بارے میں بات نہیں کی تھی اور نہ ہی بچوں نے بے پناہ تجسس کے باوجود اس موضوع کو چھیڑا تھا اگرچہ چارپائی کے نیچے پڑے ٹرنک میں جھولتا، یہ موٹا تالا انھیں بات کرنے پر اُکساتا رہتا۔ انھیں کھد بد لگی رہتی اور اس 'خزانے' کے راز کو پانے کی تمنا پروان چڑھتی جا رہی تھی۔

پھر ایک روز انصر نے تو سیدھا سیدھا ابا سے پوچھ ہی لیا کہ ابا اس میں کیا ہے؟

لیکن عبدالصمد نے جس رکھائی سے اسے منع کیا تھا، اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

اس روز، بچوں کو سکول سے چھٹی تھی۔ عبدالصمد کو بھی دفتر تو نہیں جانا تھا۔ لیکن کسی

عزیز کے جنازے میں شرکت کے لیے وہ گھر سے جلد ہی نکل پڑا تھا۔ موسم ٹھنڈا اور ابر آلود تھا۔ پھوپھی اماں، رضائی میں لیٹی بڑے خراٹے سے فرّاٹے بھر رہی تھیں۔ ادھر بچوں نے ناشتے کے دوران فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ ٹرنک کے 'راز ہائے دروں' کو 'طشت از بام' کر کے ہی دم لیں گے۔

انصر، ساتھ والی گلی میں مجید کی دُکان پر پہنچا، جو نئے تالے بیچتا تھا اور پرانے تالوں کی مرمت کرتا اور ان کو چابیاں بھی لگاتا تھا لیکن دُکان ابھی بند تھی۔ دُکان پر لگے بورڈ پر لکھا تھا۔

مجید تالا فروش

کدھر جا رہے ہو کدھر کا خیال ہے جناب

بیمار تالوں کا یہی ہسپتال ہے جناب

انصر واپس مڑا ہی تھا کہ مجید تالے والا، منہ سر مفلر میں لپیٹے آ گیا۔

''کیوں بھئی کاکے؟ کدھر؟''

''وہ چاچا جی، ہمارے ٹرنک کی چابی گم ہو گئی ہے۔ ابا کہہ گئے تھے کہ آپ کو بلا لاؤں۔ وہ خود تو ایک جنازے میں گئے ہیں۔''

''چل بھئی پہلے تیرا کام ہی کر آؤں۔ ذرا ٹھہر میں دُکان سے اپنا تھیلا نکال لاؤں۔''

مجید نے دُکان کھول کر، اوزاروں والا تھیلا نکالا دُکان پھر سے بند کی اور انصر کے ساتھ چل پڑا۔

تالا دیکھ کر مجید کہنے لگا۔

''بھئی کاکے، کیا رکھا ہے بھائی عبدالصمد نے اس ٹرنک میں۔ یہ بھاری تالا لگا رکھا ہے اور چابی بھی گم کر لی۔''

تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد تالا کھٹک سے کُھل گیا۔

''چاچا جی، کتنے پیسے؟''

''یہ تیرا کام نہیں ہے کاکے۔ میں خود ہی بھائی عبدالصمد سے لے لوں گا۔ اور ہاں اس سے کہنا اس کی چابی بنوانی ہو تو تالا لیتا آئے۔''

''چاچا جی، چائے پی کر جائیں۔'' راشدہ بولی۔

''تیرے نیک نصیب دھیئے۔ چائے کا موسم تو ہو رہا ہے لیکن گاہکی کا ٹیم ہے۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ لوگ آ کر واپس نہ مڑ جائیں۔''

جتنی دیر میں راشدہ کمرے میں پہنچی، کبیر اور انصر ٹرنک کھول بیٹھے تھے۔ اور 'خزانے' کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

''ہیں۔۔۔یں۔۔۔ں۔۔۔یہ کیا؟'' راشدہ چیخی کبیر اور انصر نے اسے گھورا کہ کہیں دادی اُٹھ گئیں تو نیا فضیحتہ کھڑا ہو جائے گا۔

ٹرنک کا بھاڑ جیسا منہ کھلا تھا۔ اس میں ایک پلاسٹک کا پیالہ پڑا تھا جس میں آٹھ انڈے تھے ان پر پین سے مختلف تاریخیں درج تھیں۔ ساتھ میں ایک پوٹلی میں کچھ روپے اور تھوڑی سی ریزگاری پڑی تھی۔

اس ٹرنک کو اتنا بڑا تالا لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ پہلی بات تو یہ کہ انڈے ٹرنک میں رکھتا ہی کون ہے؟ ابھی بچے اسی سوچ میں سرگرداں تھے کہ ابا کے کھانسنے کی آواز آئی اور اس سے پہلے کہ بچے کچھ کر پاتے عبدالصمد کمرے میں آ گیا۔

بچے اپنی جگہ اور عبدالصمد اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

پہلے تو عبدالصمد کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے لیکن پھر وہ ضبط کر گیا۔

''راشدہ، چائے بناؤ بیٹی سب کے لیے۔ سردی بہت ہے۔ پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

کبیر اور انصر، شرمندہ سے اُٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عبدالصمد رضائی اوڑھ کر

بستر میں بیٹھ گیا۔ پھر دونوں بیٹوں کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی بستر پر آ جائیں اور رضائی اوڑھ لیں۔ عبدالصمد کا موڈ اچھا دیکھ کر بچوں کی گھبراہٹ دُور ہوگئی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

راشدہ، سہمی ہوئی باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی اور ابا کی ممکنہ کڑک دار آواز کی منتظر تھی۔ لیکن جب وہ چائے لے کر آئی تو باپ بیٹے، آرام سے ایک ہی رضائی اوڑھے بیٹھے تھے۔ اس نے سب کو چائے دی اور کمرے سے جانے ہی والی تھی کہ عبدالصمد نے اسے بھی بیٹھ جانے کو کہا۔

''ٹرنک کھول کر تم لوگوں نے اچھا تو نہیں کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بے انتہا تجسس نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ میں چاہتا تو نہیں تھا کہ ٹرنک کا راز تم لوگوں پر کھلے۔ کیونکہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ اس کی وضاحت کر دینا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ تجسس کی جس حد تک تم لوگ پہنچ چکے ہو۔ اس کا قائم رہنا تمہیں مخمصے میں مبتلا کر سکتا ہے۔''

عبدالصمد نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور اپنے ماضی کی داستان، خواب کی سی کیفیت میں سنانے لگا۔

''بیٹا تمہاری ماں نسرین اور میں نے بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزاری ہے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ شہر میں اچانک ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی راشدہ اور تمہاری ماں اس کے نرغے میں آ گئیں۔ راشدہ تو خدا کا شکر ہے صحت مند ہوگئی لیکن نسرین کی حالت بہت خراب تھی وہ بہت کمزور ہوگئی تھی اور غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

''کبیر کے ابا، میں تم سے بہت خوش ہوں تم بہت اچھے شوہر اور بہت اچھے باپ ہو۔ تم نے زندگی بھر مجھے کوئی دُکھ نہیں دیا۔ لیکن اب جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ میری سانسیں

گنی جا چکی ہیں۔''

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔نسرین ایسی باتیں نہ کرو۔ خدا تمہیں صحت دے دے گا۔'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھوں گا۔

''عبدالصمد، مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو اور میری بات غور سے سنو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میرے جانے کے بعد تمہیں بہت مشکل ہوگی۔۔۔ بچوں اور گھر بار کو سنبھالنے میں۔ وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں لیکن تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اللہ کا واسطہ، ان پر سوتیلی ماں نہ لانا۔''

اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔۔۔ میں نے روتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے اور کہا۔

''نسرین تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور تم شادی کی بات کر رہی ہو۔''

اس کے چہرے پر اُداس مسکراہٹ اُبھری۔

''نہیں کبیر کے ابا یہ ضرور ہوگا۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں، اس پر عمل ضرور کرنا مجھے اُمید ہے اس طرح تم میرے بچوں کو سوتیلی ماں کے حوالے نہیں کرو گے۔''

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''نہ روؤ، میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ بس میری بات غور سے سن لو۔ جب بھی تمہارے دِل میں کسی اور عورت کا خیال آئے تم بازار سے ایک انڈا لا کر اس پر اس دِن کی تاریخ لکھنا اور پھر اسے چھپا کر رکھ لینا۔ بچوں کی نظر نہ پڑنے دینا لیکن خود اسے روزانہ دیکھا کرنا اس طرح تمہیں میری بات یاد رہے گی۔ میرے بچے بہت اچھے ہیں وہ تمہیں بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ جب انھیں اُنگلی پکڑ کر چلانے والی ماں نظر نہیں آئے گی تو وہ جلد سیانے ہو جائیں گے۔''

ساتھ ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر کبھی نہ کھولیں۔

عبدالصمد کے گالوں پر آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ بچے دم بخود بیٹھے تھے۔

''نسرین سچ کہتی تھی کئی دفعہ میں کسی دوسری عورت کو دیکھ کر اس کی طرف راغب ہوا لیکن ساتھ ہی میں نسرین کی ہدایت کے مطابق ایک انڈا خرید لاتا اور اس پر تاریخ لکھ کر اس ٹرنک میں رکھ کر تالا لگا دیتا۔ علی الصبح، جب تم لوگ سو رہے ہوتے تو میں ٹرنک کا تالا کھول کر ان انڈوں کو دیکھتا، نسرین کی بات یاد کرتا، شرمندہ ہوتا اور اپنا دھیان اس غیر عورت کی طرف سے ہٹا لیتا۔''

انصر، باپ سے بہت بے تکلف تھا۔ اس نے پوچھا۔

''اچھا ابا، یہ انڈے تو وہ والے ہوئے اور یہ رقم اور ریزگاری؟''

عبدالصمد شرمندگی سے مسکرایا۔ اس کی پیشانی عرق ریز ہوگئی۔

''جب ایک درجن انڈے جمع ہو جاتے تو میں انھیں دُکان پر بیچ آتا۔۔۔ یہ وہی رقم ہے۔''

بات ختم کر کے عبدالصمد اُٹھا۔ ٹرنک کو تالا لگایا اور چارپائی کے نیچے دھکیل دیا۔

''بچّو، تمہاری ماں بہت سمجھ دار تھی۔''

عبدالصمد یہ کہہ کر باہر کی طرف چل دیا۔

□□□

زیرو میٹر

''نکاح کر لو۔۔۔ ساتھ دو بیٹے بھی ملیں گے مفت میں۔ وہ جیسے بڑے بڑے سٹوروں والے سیل لگاتے ہیں تو لکھتے ہیں:

"Buy One, Get Two free."

''جب سالی ویسے ہی جھولی میں گری جاتی ہے تو اس سیاپے میں کیوں پڑوں؟ دماغ خراب ہے میرا؟''

عبدالکریم آنکھ دبا کر مکروہ ہنسی ہنسا۔

''او یار سمجھا کر۔۔۔ 'یہ' جوانی میں کام آتی ہے، لڑکے بڑھاپے کا آسرا بنیں گے۔ جب تو کبڑا ہو جائے گا تو چلنے کے لیے لاٹھیاں۔۔۔ تمہاری بیٹیاں تو بیاہ کر اپنے گھر کی ہو لیں گی اور چار بیٹیوں کو بیاہتا بیاہتا تو کبڑا تو ہو ہی جائے گا۔۔۔ لازمی۔''

''اُلو کے پٹھے اب تو نئی منطق لے کر آ گیا ہے۔ میری بات دھیان سے سن، میں نے اتنی لمبی پلاننگ کبھی نہیں کی۔ اللہ مالک ہے۔ وہ ہمارے پنڈ کا مسلم شیخ ہے نا!۔۔۔ گھونا۔۔۔ اسے چوہدری حسن دِین نے پیغام بھیجا کہ میری بات سن جاؤ۔ وہ آلکس کے مارے چارپائی پر ٹیڑھا میڑھا لیٹا ہوا تھا۔ بیوی سے کہنے لگا ''دیکھو رات کے لیے آٹا ہے؟''

بیوی نے کہا ''ہاں ہے۔''

تو کہنے لگا ''جا، راجے سے کہہ دے میں گھر پر نہیں ہوں۔'' اندر سے میں بھی مُصلّی ہوں۔ میں نے بھی کبھی کل کی فکر نہیں کی۔ آج چُپڑی ہوئی مل رہی ہیں۔۔۔ وہ بھی دو دو۔۔۔ تو ایویں فکریں کر کر کے مرتا رہوں۔''

عبدالکریم کی سوچ کی کمینگی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

زاہد نے ملامتی نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔

''گھور کیوں رہا ہے مجھے؟ تو میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے؟ وہ دو بیویوں والا قصہ نہیں سنا تو نے۔''

عبدالکریم نے زاہد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''ایک بھینس دودھ نہیں دیتی تھی۔ اس کے مالک نے سارے طریقے آزما لیے، اردگرد کے لوگوں نے بھی طرح طرح کے ٹوٹکے بتائے لیکن بھینس ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک آدمی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے مسئلہ سنا تو کہنے لگا بالٹی لاؤ یہ تو کام ہی کوئی نہیں۔ اس نے بھینس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو اس نے بالٹی بھر دودھ آرام سے دے دیا۔ لوگوں نے اس آدمی سے پوچھا کہ تم نے بھینس کے کان میں کیا کہا تھا؟ وہ کہنے لگا یہ راز کی بات ہے۔ لوگوں نے کہا پھر بھی کچھ تو بتاؤ تو کہنے لگا میں نے بھینس سے کہا تھا کہ آرام سے دودھ دے دو، ورنہ تمہارا وہ حال کروں گا جو دو بیویوں والے کا ہوتا ہے۔ سمجھ آیا کچھ عقل شریف میں؟''

''اور یہ گناہ شناہ۔۔۔ ان کی بھی پرواہ نہیں تجھے۔۔۔ جتنی جتنی تیرے ماتھے کی محراب کالی ہو رہی ہے۔ اتنا اتنا تیرا دِل کالا ہوتا جا رہا ہے حیا کر۔''

''تو فکر نہ کر۔ دِین اور دُنیا ساتھ چلنے دے۔ اگلے مہینے عمرے پر جا رہا ہوں حساب برابر کر کے آؤں گا۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔''

''اکیلا جا رہا ہے؟''

''تو کیا اسے بھی ساتھ لے جاؤں؟ تیری مت تو نہیں ماری گئی۔'' عبدالکریم زور سے ہنسا۔

''نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے بھابھی؟''

''اونہیں اونہیں۔ یہ جو آتی ہیں نا 'بعوض' بتیس روپے چار آنے۔۔۔ ان کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہیے۔ ٹھکانے پر رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے کھجوریں، پانی اور جائے نماز آ جائے گا۔۔۔ بس کافی ہے۔''

''بے غیرتا۔۔۔ شرم کر۔ تیرے بچوں کی ماں ہے وہ۔''

''مجھے پتا ہے۔ 'میرے' ہی بچوں کی ماں ہے وہ۔۔۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ یار تو مجھے کن گھمن گھیریوں میں ڈال رہا ہے۔ میرے بچوں کی ماں نہ ہوتی تو دریا برد نہ کر دیتا بچوں سمیت۔ لیکن میرے بچوں کی ماں ہے، میری ماں نہ بنے۔۔۔ چائے لا دوں۔۔۔ کھانا کھا لیں۔۔۔ سر دبا دوں۔۔۔ آپ کے لیے نیا سوٹ لائی ہوں سلنے کے لیے دے دیں۔ ہونہہ۔''

عبدالکریم نے ایسا منہ بنایا جیسے کونین کا گھونٹ بھر لیا ہو انجانے میں۔

''اب تیری باری ہے قصّہ سُننے کی۔'' زاہد نے عبدالکریم کے موڈ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''لے سن۔۔۔ ایک عورت کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کے آگے چھ بچے تھے وہ عورت سب کے لیے ناشتہ بناتی تو اپنے بیٹے کے لیے تو پراٹھا بنا دیتی یہ کہہ کر کہ اس نے سارا دِن کمائی کرنے میں کھجل خوار ہونا ہے۔ ہاتھ تنگ تھا۔ سب کے لیے تو پراٹھے نہیں بن سکتے تھے۔ سو باقی سب رُوکھی روٹی کھاتے جب اماں چل بسی تو اس آدمی کی بیوی ناشتہ بنانے

لگی، لیکن اس کے سامنے اس کی اولاد تھی وہ کس دِل سے شوہر کو پراٹھا دیتی اور اپنے بچوں کو روکھی روٹی پھر سوچا کہ اس نے ساری عمر پراٹھا کھایا ہے۔ کیا کہے گا کہ ماں نہیں رہی تو پراٹھا ملنا بھی بند ہو گیا۔ اس نے پیڑے کے اندر گھی لگا کر پراٹھا توے پر ڈالا لیکن اس کے اُوپر گھی لگانے کا پھر حوصلہ نہ ہوا کہ بچے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ ماں نے بھی پراٹھا نہیں دیا۔ اب جب اس آدمی نے پہلا نوالہ توڑا تو اسے احساس ہوا کہ اندر گھی لگا ہوا ہے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''واہ مولا، بیوی بھی 'جُگی' ماں ہی ہوتی ہے۔

تجھے خدمت گزار بیوی ملی ہے تو قدر کر۔ کیا سوچا ہے پھر؟''

''پھر۔۔۔ پھُر۔۔۔ یعنی چل اُٹھ، جا کے اپنی دُکان دیکھ میرا سر نہ کھا سویرے سویرے۔''

''نہ مان میری بات۔۔۔ لیکن ایک پتے کی بات تجھے بتاتا ہوں۔ دو بیویوں والے کی ماں کبھی نہیں مرتی۔''

''وہ کیسے؟'' عبدالکریم نے جل کر کہا۔

''وہ ایسے کہ جب پہلی بیوی کے گھر رات گزار کر جانے لگتا ہے تو بیوی کہتی ہے۔

''بڑی جلدی ہے ماں کے پاس جانے کی۔'' اور جب دوسری کے پاس جاتا ہے تو وہ کہتی ہے۔

''اجازت دے دی ماں نے آنے کی۔''

زاہد ہنستا ہوا اُٹھ کر چلا تو عبدالکریم نے گھما کر اپنی چپل اس کی پُشت پر ماری۔ زاہد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب صورتِ حال سنبھلنے والی نہیں۔ کیونکہ عبدالکریم میں غلط اور صحیح کی تفریق ختم ہو گئی تھی۔ وہی تفریق جو انسان کو شیطان سے جدا کرتی ہے۔ عبدالکریم کیا، سارا معاشرہ ہی اسی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ کسی وزیر نے شہر کا

دورہ کرنا ہوتا تو اس کے راستے میں سڑک کے کنارے پڑے کوڑے کے ڈھیر کو اُٹھوائے بغیر اس کے سامنے قنات لگا دی جاتی اور جھاڑو لگوا کر چونا چھڑک دیا جاتا۔ وزیر چلا جاتا تو وہی کوڑے کا ڈھیر ہوتا اور وہی راستہ۔ عبدالکریم بھی عمرے سے قنات کا کام لے رہا تھا۔

زاہد نے جوتا اُٹھا کر عبدالکریم کو 'پیش' کیا، دانت کچکچائے اور اسے قہر بھری نظروں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

''تو عمرے کو کیا سمجھتا ہے؟ تیرے خیال میں بلیک مارکیٹئے، پڑیاں بیچنے والے، ذخیرہ اندوز، دوائیوں میں ملاوٹ کرنے والے، جھوٹ بولنے والے، اپنا فرض پورا نہ کرنے والے، دوسروں کا حق مارنے والے، رِشتوں کی حرمت کا پاس نہ کرنے والے، سات 'گیڑے' لگانے سے پاک صاف ہو جائیں گے؟ جس اللہ کی آس پر تو بیٹھا ہے وہ اتنا بے انصاف ہے؟''

''یہ اتنی لمبی لمبی تقریریں کہاں سے یاد کر کے آجاتا ہے تو؟ کسی دِن مولویوں کے ہتھے چڑھ گیا تو میں تیرے قلوں کے چنے بانٹتا پھروں گا اور سن مجھے ان باتوں کا نہیں پتا۔ بس اتنا پتا ہے کہ بلاوا ہر کسی کو نہیں آتا۔'' عبدالکریم نے طنزیہ کہا۔

''بس کر، بس کر۔۔۔ دُکان چلتی ہے تیری تو تجھے معرفت کی باتیں کرنی آ گئی ہیں۔ بلاوا بھی اسے آتا ہے جس کی جیب میں پیسے ہوں۔ غریب آدمی پیٹ کاٹ کر ساری عمر پیسے جمع کرتا ہے۔ عین وقت پر گورنمنٹ دس پندرہ ہزار کرایہ بڑھا دیتی ہے تو بلاوا کینسل ہو جاتا ہے۔ بڑا آیا ولی اللہ۔۔۔''

زاہد بکتا جھکتا اپنی دُکان کی طرف چلا گیا۔ عبدالکریم کی روانگی سے ایک روز پہلے زرینہ مبارکباد دینے آئی۔ ماتھے تک دوپٹہ کھینچے، مسکین سی شکل بنائے۔ عبدالکریم کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی پکڑاتے ہوئے بولی۔

''بھاجی آپ خیر سے واپس آئیں۔ دو کپڑے لے آئیں، آتے ہوئے۔ لڑکوں کی

بری میں چڑھانے کے کام آئیں گے۔ کہتے ہیں 'سودی عرب' کا سونا خالص ہوتا ہے۔"

عبدالکریم واپس آیا تو کنگنوں کے ساتھ ایک انگوٹھی بھی تھی۔

"زرینہ تمہارے پیسے بڑھ گئے تھے سو یہ انگوٹھی بھی لے آیا۔ بڑے کی منگیتر کو پہنا دینا۔" لیکن زرینہ نے انگوٹھی اسی وقت اپنی اُنگلی میں پہن لی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔

"نہیں بھا جی یہ پیسے تو میری قسمت کے بڑھ گئے ہیں۔ یہ تو میں خود ہی پہنوں گی۔" اس کے گال خوشی سے تمتما رہے تھے۔ عبدالکریم لاپرواہی سے ماں سے باتیں کرنے لگا تھا۔

عبدالکریم کی دُکان کے ساتھ ساتھ زرینہ کے وسائل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ورنہ اس کی بیوی سلمہ کے لیے تو وہی 'بچتیں' تھیں اور وہی 'سگھڑاپا' جن پر وہ 'فخر' کرتے نہ تھکتی تھی۔

عبدالکریم کے چھوٹے بھائی عبدالخالق کی بیوی نجمہ بہت شوخ اور چلبلی سی لڑکی تھی۔ عبدالخالق نے بھائی کی شادی کے بعد ہی اس کی سالی پر آنکھ رکھ لی تھی اور پھر رشتہ طے ہونے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ عبدالکریم اور عبدالخالق دو ہی بھائی تھے۔ والد وفات پا گئے تھے۔ بہن کوئی تھی نہیں اور ماں بالکل گئو ماتا۔ 'زرینہ' ان کے چچا زاد بھائی کی بیوی تھی جو شادی کے چار سال بعد ہی دو بچے چھوڑ کر ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ عبدالکریم کے ابا اور چچا کے گھر یوں ساتھ ساتھ تھے کہ پچھواڑے ملتے تھے۔ البتہ چھت پر سے آنا جانا ہو سکتا تھا۔ لوگ باگ، عبدالکریم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ نیک بچہ ہے، گھر بھی سنبھالتا ہے اور چچا زاد کی بیوہ کا بھی خیال رکھتا ہے لیکن زاہد، عبدالکریم کا قریبی دوست ہونے کے ناتے صورتِ حال سے واقف تھا۔ یا پھر عبدالکریم کی سالی اور بھابھی نجمہ کچھ کھٹک گئی تھی اور گاہے گاہے، بہن کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے 'پتی ورتا' ہونے کے طعنے دیتی اور ساتھ ہی ساتھ عبدالکریم کے مشکوک رویے اور زرینہ کے پُراسرار طور پر بدلنے والے حالات کی طرف بھی دھیان دلاتی۔ لیکن سلمہ کے خیال میں یہ سب اس کا وہم تھا۔ سلمہ کے سامنے نجمہ

'بلند بانگ' دعوے بھی کرتی کہ اگر عبدالخالق ایسے کرے گا تو وہ اس کے دو کانوں میں سر کر دے گی وغیرہ۔ اور زرینہ پر اپنی ناراضی کا اظہار یوں کرتی۔

"اس کمبخت ماری کو اتنا تو پتا نہیں ہے کہ بات کر لینے کے بعد منہ بند کر لینا چاہیے۔ (زرینہ کے دانت ضرورت سے زیادہ اُونچے تھے اس لیے خاموشی میں بھی منہ تھوڑا سا کھلا رہتا تھا۔) مجھے جب اس پر غصہ آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ہتھوڑا لے کر اس کے دانت توڑ دوں لیکن ڈرتی ہوں کہ اس سے، اُس کا حلیہ قدرے بہتر ہو جائے گا لیکن باجی، تم نے تو پتا نہیں دھنیا پی رکھا ہے۔۔۔ ٹھنڈی ٹھار۔"

ادھر زرینہ کے وسائل میں دِن رات اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ عبدالکریم کے ساتھ عبدالخالق کو بھی اپنی 'اضافی ذمہ داریوں' کا احساس ہونے لگا تھا اور جب عبدالخالق نے اعلان کیا کہ وہ عمرے پر جا رہا ہے تو نجمہ دھک سے رہ گئی۔

"ربّا میریا۔۔۔ یہ تو سارے ہی اللہ والے ہو گئے ہیں۔"

عبدالخالق عمرے پر چلا گیا۔ نجمہ کے دِن پریشانی میں گزرنے لگے۔ وہ خواب میں دیکھتی کہ زرینہ کے دوسرے ہاتھ میں بھی انگوٹھی چمک رہی ہے تو ہڑبڑا کر اُٹھ جاتی۔۔۔ آخر چھوٹے کی منگنی پر بھی تو اس کی ضرورت پڑنے والی تھی۔

ادھر محلے والے تعریفیں کرتے کہ دونوں بھائی کتنے نیک ہیں۔ پنج وقتہ مسجد میں نماز، ٹوپی، کالی محرابیں، عمرے، تسبیح۔

دو دِن بعد عبدالخالق واپس آنے والا تھا۔ امّاں ناشتہ کرتے ہوئے جذباتی ہو رہی تھیں۔

"خدا کا شکر ہے میرے دونوں بیٹے بہت نیک ہیں۔ ان کے ابا جی بھی اللہ بخشے ایسے ہی تھے۔ نماز روزے کی پابندی۔۔۔ پھر چھوٹا بھائی فوت ہو گیا تو بھرجائی کا بھی ایسے ہی خیال رکھا جیسے میرے بچے، زرینہ کا رکھتے ہیں۔ وہ بھی دو تین سال بعد عمرے پر جاتے تھے۔

یہی ہونے جو عبدالخالق ہونے گیا ہے۔"

"کیا اماں؟" نجمہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔؟ زیرو میٹر۔"

اماں نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ ململ کے دوپٹے سے صاف کیا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سلمٰی نے دروازہ کھولا خالہ بشیراں تھی۔ بیوہ عورت کپڑے سی کر گھر چلاتی اور محلے میں اِدھر اُدھر گھوم کر دِل بہلاتی۔

"آئے ہائے تمہارے ہاں بھی بجلی نہیں ہے۔ ان 'جمہوریت والوں' کا ککھ نہ رہے۔ اپنے 'جمہور' سے ہمارے دانت بھی نکال لیں گے۔ کہتے ہیں فوجی حکومت اچھی نہیں ہوتی پر اور کچھ نہ کریں، مہنگائی تو کم کریں گے۔ ہیرامنڈیاں بند ہو جائیں گی۔ آوارہ کتوں کو زہر ڈال دیں گے۔ ابھی پرسوں ہی مجھے کتا کاٹنے لگا تھا۔۔۔" خالہ بشیراں بے تکان بول رہی تھی اور نجمہ سوچ رہی تھی "چاہے فوجی حکومت ہو یا 'جمہوری' بس اتنا کام کر دیں

'کہ آوارہ عورتوں کو زہر ڈلوا دیں

اور گھریلو چکلوں پر تالے پڑ جائیں۔"

□□□

نہیں۔۔۔یں۔۔۔یں۔۔۔

لوبل اور عمیرہ، بینک کی سیلف سروس کینٹین سے کھانا لے کر، اپنی اپنی ٹرے اُٹھائے، ڈائننگ ہال کے کونے میں آ کر بیٹھی ہی تھیں کہ عمیرہ شروع ہوگئی۔

"یہ سوچی سوچی آنکھیں۔۔۔ یہ تھکی تھکی نگاہیں، خیر باشد۔۔۔

ع تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

سلیس بیانیہ انداز میں ساری بات کہہ دو۔"

"کیا مصیبت ہے عمیرہ۔۔۔ کھانا کھاؤ آرام سے اور مجھے بھی کھانے دو۔"

"یہ ساحر آنکھوں کے بھاری پپوٹے جھکی جھکی نگاہیں اور لمبی پلکوں کے گھنیرے سائے۔۔۔ انھیں میں سلام کر لوں۔۔۔ یہیں اپنی صبح کر لوں۔۔۔ یہیں اپنی شام کر لوں۔۔۔ لیکن تم جانتی ہو بینک کی نوکری ایسا ظالم سماج ہے جو مجھے تم پر ڈھنگ سے عاشق بھی نہیں ہونے دیتا۔ ورنہ اس محرمی صورت پر سیاہی مائل سرخ لپ اسٹک۔۔۔ یقین مانو میرا دِل لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔"

"یا خدا۔۔۔ عمیرہ تم کسٹمرز سروس میں کام کرتے ہوئے سارا دِن اتنا بولتی ہو پھر بھی لنچ بریک میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔

کھانا کھانے دو۔"

"دیکھو لنچ بریک میں کھانا کھانا، پھر کافی کا کپ اور پھر۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے، اس لیے سیدھے سے بتادو کل رات جو تکیہ تم نے بھگویا تھا اسے دھوپ میں ڈال آئی ہو یا آج رات اسی میں ڈبکیاں لگانے کا ارادہ ہے؟ ویسے میں بہت سنجیدہ ہوں۔۔۔ اب کیا ہوا ہے؟"

"کچھ خاص نہیں۔۔۔ وہی قصہ پرانا ہے۔۔۔ بتاتے ہوئے بھی کمینے پن کا احساس ہوتا ہے۔"

"ان لوگوں کو کمینگی کا 'ارتکاب' کرنے پر شرمندگی نہیں ہوتی اور تم محض اس کا ذِکر کر کے۔۔۔ تمہارا کیا علاج ہے کومل؟ اگر ماں باپ نے غلطی سے تمہارا نام کومل رکھ ہی دیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ تم ساری عمر چھوئی موئی ہی بنی رہو۔ تم ایم۔بی۔اے کر سکتی ہو، اتنی اچھی جاب کر سکتی، اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی ترقی حاصل کر سکتی ہو تو کیا وجہ ہے کہ گھر پر یوں بھیگی بلی بنی رہتی ہو اور وہ بھی بلاوجہ۔۔۔"

عمیرہ کو سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

"اب بک بھی چکو۔"

"بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ پرسوں بھائی جان نے مچھلی بھجوائی تھی۔ ان کے ایک دوست محکمہ انہار میں ہیں وہ تازہ پانی کی بہت عمدہ مچھلی انھیں اکثر تحفتاً بھجواتے رہتے ہیں۔ فہیم کو مچھلی بہت پسند ہے۔ میں گھر اور باہر کے سارے کام کر سکتی ہوں لیکن مچھلی کی دُکان پر جانا بہت مشکل ہے میرے لیے۔ مجھے اس کی ہیک سے وحشت ہوتی ہے۔ بھائی جان اس بات سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ فہیم کے خیال سے مچھلی میں سے میرے گھر کا حصہ ضرور نکال لیتے ہیں۔"

"لیکن یہ مخدوم صاحب خود کیوں نہیں مچھلی خرید کر لاتے، اگر اِتنی پسند ہے تو؟"

"کون مخدوم صاحب؟"

"تمہارے شوہر نامدار۔۔۔ فہیم صاحب دی گریٹ جنھیں تم نے شہزادہ سیف الملوک بنا کر رکھا ہوا ہے۔"

"اب نہیں جاتے تو میں کیا کروں؟"

"چلو خیر۔۔۔ آگے چلو۔۔۔ مچھلی کے ساتھ ساتھ تمہاری شامت کیوں آئی؟"

"میں بینک سے تھکی ہوئی واپس گئی تھی اور کل پنکی کا ٹسٹ بھی تھا maths کا، اسے تیاری کروانا تھی اس لیے میں نے مچھلی پکائی نہیں، صرف دھو کر اسے marinate کر کے فریزر میں رکھ دیا کہ کل تسلی سے فرائی کروں گی۔ کل گھر گئی ہوں تو امی جان، نیلوفر کے گھر جانے کو تیار تھیں۔ فہیم اور ان کا، دونوں کا موڈ سخت خراب تھا۔"

"کیوں؟ تم نے انھیں جانے پر زبردستی مجبور کیا تھا؟"

عمیرہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں، میرا قصور یہ تھا کہ میں نے پرسوں ہی مچھلی کیوں نہیں پکائی تھی؟۔۔۔ اب امی جان جا رہی ہیں تو۔۔۔ یقین مانو مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ ان کا جانے کا پروگرام ہے۔۔۔ کتنی چھوٹی بات ہے۔"

"خیر، ایسی چھوٹی بات بھی نہیں ہے۔ تمہیں امی جان کے 'پرنٹڈ پروگرام' سے باخبر ہونا چاہیے۔ امی جان 'آخری بار' مچھلی کھائے بغیر 'رُخصت' ہو جائیں۔۔۔ تمہارے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں۔ حد ہوگئی ہے بلکہ حد سے بھی 'ودھ' ہوگئی ہے۔"

"اچھا فضول باتیں نہ کرو۔ میں اسی طرح ڈبہ فریزر میں سے نکال لائی کہ امی جان جاتے ہوئے، پھل اور مٹھائی کے ساتھ مچھلی بھی نیلوفر کے لیے لیتی جائیں لیکن کہاں۔۔۔ ماں بیٹے نے وہ بے نقط سنائیں کہ بس۔۔۔ فہیم نے کہا تمہارے بھائی کی بھیجی ہوئی مچھلی، امی جان نہ بھی کھائیں گی تو کیا فرق پڑے گا؟ میں خود ان کے لیے مچھلی لے

آ ؤں گا۔اب دیکھواس میں بھائی جان کاذِکر کہاں سے آ گیا۔۔۔وہ تو مچھلی بھیج کر گناہ گار ہو گئے۔۔۔یہ لوگ میرے گھر والوں کو بلاوجہ باتیں بناتے ہیں تو مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔"

"مجھے تو اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔اب مچھلی خریدنے کی ذمہ داری مخدوم صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔تمھیں اور کیا چاہیے؟ ہمیشہ مثبت انداز سے سوچنا چاہیے۔البتہ جب امّاں جان بغیر مچھلی کھائے 'گذر' گئیں اور تم ان کی یاد میں بیٹھی آنسو بہاتی رہیں تو تمہارا یہ فعل بہت احسن تھا ہر اچھی بہو کا یہ فرض بنتا ہے کہ ساس کے 'گذر' جانے پر ٹسوے ضرور بہائے۔"

"اچھا، فضول نہیں۔۔۔اسی لیے میں تمہارے ساتھ کوئی بات share نہیں کرتی۔تم اس کا بتنگڑ بنا کر دم لیتی ہو۔"

"تف ہے تم پر کومل رانی بلکہ نو پھول شہزادی میں کہے دیتی ہوں کہ اپنے آپ کو بدلو۔تمہارے میاں اور سسرال والے دِن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔اگر تمہارا رویہ یہی رہا تو کسی دن چارپائی پر پڑ جاؤ گی خدانخواستہ۔۔۔اور کچھ نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کرو۔"

"انھی کے خیال سے تو چپ رہتی ہوں کہ وہ مجھے زبان چلاتے ہوئے دیکھیں گے تو کیا تاثر قائم کریں گے؟"

"دیکھو کومل، بچے اب اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں۔وہ تمھیں گھٹ گھٹ کر روتے دیکھتے ہوں گے تو انھیں کونسی خوشی ہوتی ہوگی؟

تم نے کیا نہیں کیا اپنے گھر کے لیے؟ بینک کی جاب تو مردوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہے، لمبے اوقاتِ کار اور اعصاب شکن ذمہ داری۔۔۔اور تم اس کے ساتھ ساتھ گھر کی مکمل ذمہ داری بھی نبھا رہی ہو۔بینک سے loan لے کر تم نے نیلوفر صاحبہ کی شادی کا بندوبست کیا۔بینک سے ہی loan لے کر گھر بنایا۔بچوں کو پڑھاتی ہو خود ڈرائیور کرتی ہو۔اور مرے کی لاش پر سو دُرّے یہ کہ سسرال کے ہر فرد نے تم پر اپنے دانت تیز کر

رکھے ہیں اور تمہارے شوہر کو اتنی تمیز نہیں کہ تمہاری حمایت یا تعریف تو کیا کرے گا۔اُلٹا ان لوگوں کو شہ دیتا ہے اور ان سے بڑھ کر تمہاری بے عزتی کرتا ہے۔یہ کہاں کی شرافت ہے۔نیلوفر اور زعیم تم سے چھوٹے ہیں اور تمھیں کسی کھاتے میں نہیں رکھتے۔تمہارے جیٹھ عظیم صاحب اور بھی عظیم ہیں اور امی جان تو ان سب کی ماں ہیں سبحان اللہ۔"

عمیرہ جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے ساتھ ساتھ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

کومل کی آنکھیں بھر آئیں تو اس نے ٹشو پیپر میں آنسوؤں کو جذب کیا اور پلیٹ میں چمچہ کانٹا برابر میں رکھ دیا یعنی اب اور کھانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

عمیرہ نے حالات دگرگوں ہوتے دیکھے تو بات کا رُخ بدل دیا۔

"میں تمھیں ایک لطیفہ سناتی ہوں سویٹ ڈش کے طور پر۔۔۔ایک آدمی بہت بدتمیز تھا تمہارے فہیم جیسا۔ایک روز اس کا دوست گھر پر آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے برآمدے میں چارپائی پر لیٹے لیٹے ہانک لگائی اور بیوی سے کہا۔

"کُتیے، تجھے سنا نہیں، دروازہ دیکھ۔"

وہ بے چاری بھاگی دروازے پر۔دوست اندر آ گیا تو شوہر بنکارا۔

"کُتیے، ادھر دفع ہو، منجی ڈاہ، نظر نہیں آتا، میرا دوست آیا ہے۔"

وہ جلدی سے چارپائی اُٹھا لائی۔

"شربت لے آ جلدی سے اور کُتیے دیر کی نا تو دیکھنا پھر ہوتا کیا ہے؟"

وہ شربت لے کر آئی ہی تھی کہ شوہر نے فرمایا "کُتیے تجھے عقل ہے کہ نہیں۔۔۔ہانڈی تیرا باپ چاہڑے گا؟"

مہمان ایک روز ٹھہرا اور یہی کچھ سنتا رہا۔اگلے روز جانے لگا تو دوست کی بیوی سے بولا۔

"اچھا بھین کُتیے۔۔۔میں چلتا ہوں، تیرا رب راکھا۔"

عمیرہ نے بات ختم کر کے، کومل کی طرف دیکھ کر آنکھیں مچکائیں تو وہ بے ساختہ
ہنس دی۔

کافی پینے کے دوران عمیرہ کچھ نہیں بولی۔ جب بریک ختم ہونے پر وہ واپس اپنی
سیٹ پر جا رہی تھیں تو کہنے لگی۔

''اچھا باجی کومل۔۔۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ بھین گُتی نہ بنو۔ AVP مسز کومل فہیم اپنی
worth پہچانو۔ تیرا ربّ راکھا۔''

کومل کی نظروں میں شکر گزاری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

شام کو کومل گھر پہنچی تو لاؤنج میں اپنے جیٹھ عظیم اور فہیم کو خراب موڈ میں بیٹھے دیکھ کر
اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ساتھ میں فہیم کا اَن پڑھ، جاہل ماموں زاد راشد حسین تشریف فرما تھا۔ جسے
عمیرہ 'جنرل سیکرٹری بان کی مون' کہتی تھی۔ کیونکہ وہ ہر ایسے نام نہاد 'جرگے' میں شامل ہوتا
تھا جو کومل کے لیے call کیا جاتا تھا۔

''کومل ادھر آؤ۔۔۔ یہاں بیٹھو۔''

فہیم نے اپنے سامنے قالین کی طرف اشارہ کیا۔ ہر جرگے کا format یہی ہوتا
تھا کہ 'منصفین' تو صوفے پر سج کر بیٹھ جاتے اور 'بے کس ملزم' کومل، جس پر فردِ جرم عائد کی
جاتی، اسے ان کے حضور قالین پر بیٹھنا پڑتا۔

''السلام علیکم'' کومل منمنائی۔

اس کے جیٹھ نے سلام کا جواب دینا غیر ضروری خیال کرتے ہوئے سیدھا سیدھا
'مقدمے' کی کارروائی شروع کی۔

''تم کل میرے گھر گئی تھیں؟''

''جی''

''کیوں؟''

''بھابھی جان نے کہا تھا کہ بینک سے واپسی پر شازیہ کے دوپٹے، ڈائر سے لے
کر انھیں پہنچا دوں۔''

''یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن تم نے میری بیٹی شازیہ کو جو اتنی باتیں بنائیں وہ کس
کھاتے میں تھیں؟ تم ہوتی کون ہو ایسا کرنے والی اور تمھیں جرأت کیسے ہوئی؟''

''میں نے باتیں بنائیں؟ میں تو ادھر ٹھہری ہی نہیں۔ بس دوپٹے پکڑائے اور چلی
آئی۔ شازیہ سے تو میرا آمنا سامنا ہی نہیں ہوا۔''

کومل نے حیرانی سے کہا۔

''بکواس کرتی ہو۔۔۔ بھائی صاحب غلط تو نہیں کہہ رہے۔'' فہیم چنگھاڑا۔

''فہیم یقین مانیے۔۔۔''

''کیا یقین کروں۔۔۔ تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو۔ میں نے غلطی کی جو تمھیں
پہلے ہی ٹھکانے پر نہیں رکھا۔''

(بھین گُتی نہ بنو۔۔۔ عمیرہ کی سرگوشی، کومل کے کان میں گونجی۔)

''بھائی جان میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ بلا وجہ ناراض ہو رہے ہیں۔ البتہ
آپ نے میرے ساتھ چھوٹی بھابھی ہونے کے ناتے کبھی شفقت نہیں برتی۔ حتیٰ کہ آپ
نے میرے کردار پر کیچڑ اُچھالا کیونکہ عورت کے کردار پر منفی تبصرہ ہمارے معاشرے کا آسان
ترین کام ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کوئی غیر ایسی بات کرتا تو آپ اس کا منہ توڑ
دیتے کہ میں آپ کے خاندان کی عزت ہوں۔ کجا یہ کہ آپ نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔
آپ تو میرے بڑے تھے آپ نے ایسے کیوں کیا؟''

''میں نے آج تک ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

عظیم صاحب گرجے۔

''کیوں فہیم۔۔۔ بھائی صاحب نے ایسا کہا تھا یا نہیں؟ آپ کو یاد ہوگا اور یہ بھی

یاد ہوگا کہ آپ نے اس بات کا بالکل برا نہیں منایا تھا۔'' کومل نے بہت رسان سے کہا۔

''نہیں، بھائی صاحب نے تمہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ تم بکواس کر رہی ہو۔۔۔ محض الزام تراشی۔''

''اچھا؟؟؟''

(''نہیں۔۔۔یں۔۔۔یں۔۔۔'' کومل کے اندر سے بے آواز چیخ بلند ہوئی۔

''میں بھین کُتّی نہیں بنوں گی۔'')

وہ قالین سے اُٹھی اور بڑے وقار سے سامنے صوفے پر جا بیٹھی۔

''جی تو بھائی صاحب! آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟''

''کیا اب مجھے بار بار پوچھنا پڑے گا کہ کل جب تم میرے گھر گئیں تو تم نے شازیہ کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی؟''

''اور میں بار بار آپ سے کہہ چکی ہوں کہ کل تو میں آپ کے ہاں گئی ہی نہیں۔'' کومل نے بہت تیقن سے کہا۔

''کیا؟؟؟'' عظیم صاحب غرائے ''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ گئی تھی۔''

''جی۔۔۔ اور ابھی میں کہہ رہی ہوں کہ میں کل آپ کے گھر ہرگز ہرگز نہیں گئی۔ اگر آپ مُکر سکتے ہیں تو میرے لیے بھی یہ خلافِ طبع ضرور ہے مشکل نہیں۔'' کومل مسکرائی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' فہیم کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

''جی بالکل۔۔۔ یہ بھی میری عادت نہیں ہے آپ لوگوں کی طرح لیکن ناممکن نہیں۔ اب بتائیے میرے لیے کیا حکم ہے؟'' کومل کھلکھلائی۔

پھر اس نے کام والی بچی کو آواز دی۔

''نصرت بیٹا۔۔۔ مہمانوں کو چائے پلاؤ۔''

پھر عظیم، بان کی مون اور فہیم کو مخاطب کر کے کہا۔

''لیجئے آج کا اجلاس برخاست ہوتا ہے آئندہ بات ہوتی رہے گی۔''

''پنکی، بنٹو۔۔۔ آؤ دیکھو میں نئی DVD لائی ہوں۔ مِل کر دیکھتے ہیں۔ AC آن کرو اور DVD پلیئر Set کرو۔ میں change کر کے آتی ہوں۔ نصرت بیٹا تم بھی مہمانوں کو چائے دے کر آ جاؤ۔ مزے کرو۔۔۔ رات کے کھانے کے لیے میں پیزا آرڈر کرنے لگی ہوں۔''

اگلی صبح ناشتے کی میز پر کومل ذرا دیر سے پہنچی کیونکہ رات بھر وہ بہت اچھی نیند سوئی تھی۔ اس لیے آج اسے اپنا تکیہ بھی عمیرہ کے بقول دھوپ میں نہیں ڈالنا تھا۔

فہیم ٹوسٹ پر مکھن لگا کر بچوں کی پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ ایک سلائس، کومل کی پلیٹ میں بھی رکھ دیا۔ نگاہیں مستقل جھکی ہوئی تھیں۔

(''امّی جان نے نام تو صحیح رکھا ہے۔۔۔ فہیم! یعنی فہم والا عقل مند تبھی تو ایک ہی جھٹکے میں سمجھ گیا ہے۔'')

کومل یہ سوچ کر مسکرائی اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے آہستہ سے گنگنائی۔

۔۔۔ یہ جھکی جھکی نگاہیں۔۔۔ انھیں میں سلام کرلوں۔۔۔

□□□

وِدوھوا

شعلہ وش لباس اور زریں زیورات سے سجی، دُلہن بنی شبانہ، جیتی جاگتی قیامت لگ رہی تھی۔ رفیع نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"واہ! میری ماں کی پسند کس قدر حسین ہے۔" یہ اس نے صرف دِل میں کہا ورنہ وہ تو یوں مبہوت رہ گیا تھا کہ فوری طور پر کچھ کہہ ہی نہ پایا اور پھر جب اس کی نظر شبانہ کی سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی سڈول کلائی پر پڑی جسے سہاگ کی کانچ کی سرخا سرخ چوڑیوں نے جکڑ رکھا تھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"آپ کبھی کانچ کی چوڑیاں مت اُتاریے گا آپ کی کلائی نے تو ان کی قیمت سونے کی چوڑیوں سے بھی سوا کر دی ہے۔"

اور پھر یہی ہوا۔ رفیع نے شادی کی پہلی رات جس چاہت سے یہ بات کہی تھی شبانہ نے اسی محبت سے اس پر عمل کیا۔ کانچ کی چوڑیوں کی چمک ذرا سی ماند پڑتی تو وہ بازار چل دیتی۔ سرخ، سبز، رنگا رنگ چوڑیوں سے سجی اس کی کلائی رفیع کو دیوانہ بنا دیتی۔ اور جب صبح میں وہ بیڈ ٹی کی پیالی رفیع کو تھماتی تو کوئی دِن ایسا نہ جاتا کہ جب وہ شبانہ کا ہاتھ تھام کر کانچ کی چوڑیوں کو سہلاتا ہوا نہ کہتا۔

"واہ رے کانچ۔۔۔ تیرے نصیب۔"

اور شبانہ یوں سمٹ جاتی جیسے یہ الفاظ وہ پہلی بار سن رہی ہو۔۔۔ سہاگ رات کی طرح۔

شبانہ کی سہیلیاں اس پر رشک کرتیں کہ ان کی شادی کو نو سال گزر گئے۔ وہ دو بچوں کی ماں بن گئی، بچے سکول جانے لگے لیکن نہ تو کبھی شبانہ نے چوڑیاں پہننے میں کوتاہی کی اور نہ ہی رفیع نے تعریف کرنے میں خسّت برتی۔

جب ان دونوں کی شادی ہوئی تو رفیع نے ایک چھوٹا سا "بچ مچ" کا انگلش میڈیم سکول کھول رکھا تھا۔ وہ خود بھی ایم۔اے انگلش تھا پھر مونٹیسوری اور سکول ایجوکیشن میں کچھ کورسز بھی کر رکھے تھے۔ سکول بہت اچھا تھا لیکن اس وقت اس میں بچوں کی تعداد کم تھی اور اخراجات زیادہ تھے۔ تنگ دستی تو نہیں تھی لیکن فراغت بھی نہ تھی۔ ایسے میں بھی شبانہ گھر کے اخراجات میں کمی بیشی سے کام لے کر، رفیع کی خواہش پوری کرنے کی خاطر نفیس، مہنگی اور خوبصورت چوڑیاں خریدتی۔

رفیع بہت محنتی واقع ہوا تھا۔ ان نو برسوں میں سکول کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اب تو سکول کی اپنی عمارت تھی جو کسی بھی اچھے تعلیمی ادارے کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر بنائی گئی تھی۔ اپنے لیے گاڑی کے علاوہ ایک چھوٹی کار اس نے شبانہ کو بھی لے دی تھی۔ شبانہ نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ اس لیے بچوں کو سکول لانے، لے جانے، بازار اور رِشتہ داروں کے ہاں آنے جانے کی ذِمہ داری بھی شبانہ کی ہی تھی۔ جو وہ بخوشی پوری کرتی تھی کہ رفیع کے کام میں رخنہ اندازی نہ ہو۔

بچے ایک دوسرے اچھے سکول میں پڑھ رہے تھے کیونکہ رفیع کا خیال تھا کہ اپنے سکول میں پڑھانے سے انھیں سٹاف، دیگر بچوں اور چھوٹے عملے کی نہ چاہتے ہوئے بھی بھرپور توجہ اور بلاوجہ کی اہمیت ملے گی جو ان کی تربیت اور شخصیت پر منفی طور پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

رفیع کے سکول میں سالانہ تقریبِ تقسیمِ انعامات تھی۔ شبانہ نے اس کے لیے بطورِ خاص ایک خوبصورت سا سوٹ سلوایا تھا اور ظاہر ہے ساتھ میں میچنگ چوڑیاں لینا تو وہ بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ شبانہ ان نو برسوں میں ایک چنچل لڑکی کی بجائے ایک گریس فل خاتون میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی سڈول کلائیاں اب بھی سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی لگتی تھیں اور ہر ایک کی نظر ان پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب وہ سکول پہنچی تو فنکشن شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ رفیع اس کے لیے آخری تیاریوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ سکول کا ٹیچنگ سٹاف، اپنی اپنی ڈیوٹی میں سے وقت نکال کر شبانہ سے ملنے آ رہا تھا۔ سبھی اس کے اخلاق اور شخصیت سے بہت متاثر تھیں۔

اسے دیکھتے ہی ایک نئی آنے والی ٹیچر نے بے ساختہ کہا۔

''میڈم، آپ کی کلائی میں کانچ کی چوڑیاں کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔''

ایک پُرانی ٹیچر جو کئی بار شبانہ سے مِل چکی تھی کہنے لگی۔

''میڈم ہمیشہ ایسے ہی چوڑیاں پہنے رہتی ہیں۔ لگتا ہے سَر رفیع کو بہت پسند ہیں۔''

شبانہ دھیرے سے مسکرائی۔

ایک ٹیچر بولی۔

''ہمارے سکول میں ایک نئی ٹیچر آئی ہیں وہ بھی کانچ کی چوڑیاں ضرور پہنے رکھتی ہیں۔ انھیں بھی بہت جچتی ہیں۔''

پھر ان لوگوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔

شبانہ نے سوچا وہ اس ٹیچر سے ضرور ملے گی لیکن فنکشن شروع ہو گیا اور وہ یہ بھول ہی گئی کہ اسے اس ٹیچر سے 'ضرور' ملنا تھا۔ کیونکہ دبی دبی ہنسی اور معنی خیز نظروں نے اسے متجسس کر دیا تھا۔

کچھ روز کے بعد، بچوں کے سکول میں 'مووی ایوننگ' تھی۔ رفیع ابھی گھر واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ فون پر شبانہ کو بتا دیا تھا کہ 'ویک انڈ' ہے اس لیے وہ اپنے ایک دوست سے ملنے جائے گا اور گھر دیر سے پہنچے گا۔

شبانہ بچوں کو سکول چھوڑ کر واپس مڑی تو ٹریفک بُری طرح جام تھا۔ وہ دوسرے راستے سے واپس آئی جو رفیع کے سکول کے سامنے سے گزرتا تھا۔ گیٹ میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور چوکیدار بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ رفیع کے آفس کی لائیٹ جل رہی تھی۔ شبانہ نے سوچا رفیع کتنی محنت کرتا ہے۔ اس وقت بھی آفس میں مصروف ہے۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ بھی یہیں اس کے پاس بیٹھ جائے پھر دونوں اکٹھے بچوں کو لے کر گھر چلے جائیں گے۔

وہ گیٹ سے داخل ہو کر سیدھی رفیع کے آفس کی طرف بڑھی جو کہ مین گیٹ کے ساتھ ہی تھا۔ چوکیدار ہائیں ہائیں ہی کرتا رہ گیا۔ آفس کا دروازہ بند تھا لیکن کھلی کھڑکی میں سے رفیع کی آواز آ رہی تھی۔

''واہ رے کانچ تیرے نصیب۔''

دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا۔ اس لیے شبانہ جلدی سے اندر داخل ہوئی اور پتھر کی ہو گئی۔ صوفے پر ایک خوبصورت چنچل لڑکی بیٹھی تھی اور اس کی گود میں سر رکھے ہوئے، رفیع نے اس کی سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی سڈول کلائی تھام رکھی تھی اور کانچ کی چوڑیوں کو سہلاتے ہوئے بڑے جذب سے کہہ رہا تھا:

''واہ رے کانچ تیرے نصیب۔''

شبانہ کو دیکھتے ہی وہ پاپ کارن کی طرح اُچھلا اور چیخا:

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟ کُتّی، حرامزادی، فلرٹ۔۔۔''

رفیع نے ایک ہی جست میں تمام حدیں پار کر دیں۔ نہ اپنے دامن کو دیکھا اور نہ

بندِ قبا کو اور شبانہ کے نام پر اتنے بے نام دھبے لگا دیے کہ اس کا اپنا رنگ تو کہیں چھپ ہی گیا
اور یہ سب کیا محض شبانہ پر دباؤ ڈالنے اور اپنی کھسیاہٹ کو چھپانے کے لیے۔

لیکن شبانہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اسے ہوش ہی کہاں تھا؟ اور اگر ہوتا بھی تو وہ کیا کہہ سکتی تھی؟۔۔۔ وہ اس کا 'مجازی خدا' تھا اور خدا بے نیاز ہے۔۔۔ اپنی مرضی کا خود مالک اور شبانہ ان مجبوروں میں سے ایک جس پر مختاری کی ناحق تہمت ہے۔

شبانہ کیسے واپس مڑی؟ کیسے بچوں کو لیا؟ کیسے گھر پہنچ کر انھیں کھانا دیا؟ اسے کچھ خبر نہ تھی اور چپ بستر پر لیٹی تو کچھ یوں کہ:

'بچھڑ کر کارواں سے راہ رو ایسا ہوا تنہا!!!

تھکا تنہا

گرا تنہا

اُٹھا تنہا

چلا تنہا'

اسے پہلی بار اس کرب سے گزرنا پڑ رہا تھا جو اتنا اچانک اور جان لیوا تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا رفیع ،صرف اور صرف سڈول کلائی میں سجی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کا دیوانہ تھا اور اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں تھا کہ وہ کلائی شبانہ ہی کی ہو۔ اس دوسری عورت کی کلائی بھی اس کے لیے اتنی ہی اہم تھی جتنی کہ اس کی بیوی شبانہ کی۔۔۔ تو کیا کسی تیسری، چوتھی یا پھر پانچویں عورت کی کلائی میں چوڑیوں کی صورت میں ڈھلا ہوا کانچ بھی 'نصیب والا' ہو سکتا ہے؟

رفیع کے نزدیک شبانہ کی نو سالہ محبت اور خدمت کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اس دوسری خاتون کی کلائی، ہو سکتا ہے شبانہ کی کلائی سے بھی زیادہ خوبصورت ہو لیکن وہ عورت، رفیع کے بچوں کی ماں تو نہیں تھی نا! شبانہ نے تو شادی کی رات پہلی بار رفیع کو دیکھا اور پھر

اس کی نظر کسی اور کی طرف اُٹھی ہی نہیں اور رفیع کلائیوں کی کھوج میں رہا؟

یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ڈھلا۔ ساون بھادوں کی جھڑیاں اس کی آنکھوں سے برستیں بھی تو کونسا اس کے دِل کی پیاس بجھ جانے والی تھی۔ اعتماد، وعدے اور تعلقات وہ چیزیں ہیں جو ٹوٹتی ہیں تو آواز ہی نہیں آتی بلکہ زندگی میں سناٹا چھا جاتا ہے۔

اسے سرما کی بے توجہ چاندنی رات کی طرح اپنا آپ بے مایہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ کس سے کہے؟ اور کوئی اس کے لیے کر بھی کیا سکتا ہے؟ بچوں کے بعد ازدواجی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ مرد اور عورت کی زندگی انھی بچوں کے نام ہو جاتی ہے یا ہو جانی چاہیے۔ اگر رفیع کو اس بات کا خیال نہیں آیا تو اسے تو ان کے بارے میں کچھ مثبت سوچنا ہے نا! یہ موقعہ نفع و نقصان کی شطرنج کھیلنے کا نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھوں میں اعتبار کی کرچیوں کے زخم ہیں لیکن پھر بھی اسے سفر میں رہنا ہے۔۔۔ مدام سفر۔۔۔ وہ راستہ نہیں بھولے گی کیونکہ اس کے بچے نشانِ منزل ہیں۔

اور جب رفیع کی گاڑی کی پورچ میں رُکنے کی آواز آئی تو اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی نیند کی گولی جو وہ واپسی پر میڈیکل سٹور سے خرید لائی تھی۔ منہ میں رکھی اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پانی اپنے اندر اُنڈیل لیا۔ پہلے اس نے ۲۰ گولیاں ایک ساتھ لے لیں تھیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس سانحے کے بعد نیند اس سے رُوٹھ جانے والی تھی۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں شدتِ غم سے وہ ساری گولیاں ایک ساتھ نہ کھا لے (وہ اپنے آپ سے خوفزدہ تھی) اس نے صرف ایک گولی لی تھی۔۔۔ اسے اپنے بچوں کے لیے جیتا ہے (گویا اس وقت بھی اس کے حواس کام کر رہے تھے! وہ کتنی مضبوط ہے۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا۔) میڈیکل سٹور والے نے بھی بغیر کسی حیل و حجت کے اتنی نیند کی گولیاں ایک ساتھ تھما دی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ یہ کہاں استعمال ہونے والی ہیں؟ وہ کسی سے بیزار ہے یا خود اپنی

زندگی سے؟۔۔۔شبانہ نے سوچا تھا کہ ہمارے ہاں یہ کتنی بڑی 'سہولت' ہے۔

رفیع کے کمرے میں آنے پر اس نے کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں اور یہ سوچتے سوچتے کہ اُسے 'کُتی اور فلرٹ' کہنے کا حق تو 'مجازی خدا' ہونے کے ناتے رفیع کو حاصل تھا لیکن 'حرامزادی' کہہ کر اسے اور اس کے مرحوم والدین کو گالی دینے کا 'حق' اسے کس نے دیا؟ مہربان رات نے اسے اپنی آغوش میں لے کر نیند کی وادی میں اُتار دیا۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو ایک لمحے میں اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور رات کا منظر اس کے سامنے یوں عیاں ہوا کہ اپنی چیخیں دبانے میں اسے بہت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

ے نہ ہاتھ تھام سکے نہ پکڑ سکے دامن
بہت قریب سے اُٹھ کر بچھڑ گیا کوئی

والا معاملہ تھا۔لیکن معمول کے مطابق اس نے بچوں کو سکول چھوڑا تو رفیع ابھی تک بستر میں تھا۔کسلمندی اُسے اُٹھنے نہیں دے رہی تھی۔۔۔بیڈ ٹی کی پیالی اسے چاک و چوبند بناتی تھی۔ آخر اس نے سوچا کہ اُٹھ ہی جائے کیونکہ کل کے واقعہ کے بعد بیڈ ٹی کی پیالی کی اُمید رکھنا بے وقوفی ہے لیکن اتنے میں شبانہ کی آواز آئی۔

''چائے لے لیجیے۔''

رفیع نے خوشگوار حیرت سے آنکھیں کھولیں تو شبانہ کے دائیں ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی لیکن سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی اس کی سڈول کلائی سونی تھی۔ چوڑیوں کو توڑنے سے کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کی کلائی کو زخمی کر گئے تھے۔اور اس کی سلگتی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ سفید دوپٹے کے ہالے میں ویران صحرا کا منظر پیش کر رہا تھا۔

□□□

بندی خانہ

ڈاکٹر ذیشان احمد کے سائیکاٹری کلینک کے باہر، ڈرائیور نے گاڑی روکی تو ماہین نے ایک لمبی سانس بھری اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اندر داخل ہو گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ویٹنگ رُوم کشادہ اور روشن تھا۔ ان ڈور پلانٹس کی وجہ سے ماحول اور بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ جب انھوں نے ریسپشنسٹ سے کارڈ حاصل کیا تو اس نے بتایا کہ انھیں پہلے کمرہ نمبر ۲ میں سوشیالوجسٹ سے ملنا ہو گا۔

سوشیالوجسٹ ایک 35 سالہ ہنس مُکھ سی خاتون تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے سے پیشتر، مریض کی ہسٹری اور اس کے Socio-economic حالات، ایک سوالنامہ کے جوابات کی صورت میں درج کیے جاتے ہیں۔ اس میں تقریباً بیس منٹ صرف ہوئے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ویٹنگ رُوم میں آ کر بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی اور مریض کو دیکھ رہے تھے۔ اس لیے انھیں انتظار کرنا تھا۔

ایک کونے میں لگا ٹی۔وی آن تھا۔ خبرنامہ آ رہا تھا لیکن ماہین نے اس سے نظریں ہٹا لیں۔ ایک رسالہ اُٹھا لیا اور کانوں کے 'شٹر' بند کر لیے۔ وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھیں اس میں کوئی بھی پریشانی کی بات، ان کی اُداسی میں اضافے کا باعث بنتی تھی اور آج کل

خبریں تو الف سے یے تک پریشانی کا مرقع تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی اپنے ساتھ دس بارہ سالہ لڑکے کو لیے داخل ہوئی۔ لڑکی نے سفید یونیفارم پہن رکھا تھا اور اُوپر سے سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ کندھے پر ڈالے ہوئے بیگ میں کتابیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی کالج کی طالبہ ہے۔ لگاتار، بے آواز بہتے ہوئے آنسو، اس کی گالوں کو بھگوئے دے رہے تھے۔

لڑکے کو کرسی پر بیٹھا کر وہ استقبالیہ پر گئی اور کچھ بات کی جس کا جواب اسے نفی میں ملا۔ لڑکی کے چہرے پر مایوسی کے آثار تھے۔ ریسپشنسٹ نے دوبارہ نفی میں جواب دیا اور ماہین کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر وہ لڑکی واپس آ کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئی اب اس کے آنسو مزید تیزی سے گرنے لگے تھے۔ لڑکے نے اس کے آنے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں اور بے تاثر۔۔۔ وہ کسی معمول کی طرح اپنے اردگرد سے لاتعلق بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی تین اُنگلیوں پر میلی کچیلی سی پٹی بندھی تھی۔

ماہین کہ سدا کی نرم دِل اور ہمدرد خاتون تھیں، اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس لڑکی کے پاس جا بیٹھیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں:

''کیا بات ہے بیٹا؟ کیوں اس بُری طرح رو رہی ہو؟ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

ماہین نے مزید کُریدا تو اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے 35 کلومیٹر دُور ایک قصبے شیر گڑھ سے آئی ہے۔ اپنے والدین کو بتائے بغیر۔ وہ شیر گڑھ کے مقامی انٹر کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے۔ وہ جلدی واپس جانا چاہتی ہے تاکہ والدین کو معلوم نہ ہو سکے کہ وہ کالج نہیں گئی اور یہاں موجود ہے۔

''بیٹا آپ کو آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ والدین کو بتائے بغیر۔۔۔''

''میڈم میں مجبور ہوں، اگر انھیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے کبھی آنے کی اجازت نہ

دیتے۔۔۔ اور میرا بھائی سخت تکلیف میں ہے۔''

''بیٹا آپ کے بھائی کی اُنگلیاں زخمی ہیں کیا؟ یہ ڈاکٹر تو ماہرِ نفسیات ہیں۔ آپ اسے کسی اور ڈاکٹر کو دکھائیں۔''

''میڈم، اس کی اُنگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں بلکہ یوں کہیے۔۔۔ توڑ دی گئی ہیں۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ چپ چاپ۔۔۔ کھویا کھویا۔ کسی بات میں دِل چسپی نہیں لیتا تھا۔ ایک روز اس نے گھر کی چھت سے باہر گلی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ تو خدا نے اسے بچانا تھا، باہر بڑے بڑے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کی اچانک نظر پڑی اور انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر گرنے سے بچا لیا اور جب اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں مر جانا چاہتا ہوں۔ میرے والدین اور تمام گاؤں والوں نے یہی کہا کہ اس کے اندر جن ہے جس نے اسے پٹخا کر نیچے پھینک دیا۔ برادری کا کوئی آدمی ایک عامل بابا کو بلا لایا۔ اس نے جن نکالنے کے لیے اس پر تشدد کیا اور اس کی یہ حالت بنا دی، پیر نے اس کی اُنگلیوں کے درمیان چمٹا رکھ کر دبایا تو تین اُنگلیوں کی نازک ہڈیاں تڑخ گئیں۔''

ماہین نے تاسف سے بچے کی طرف دیکھا ''میں کالج میں نفسیات کا مضمون پڑھ رہی ہوں، میں سمجھتی ہوں کہ اسے کسی پیر کی نہیں ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے۔ لیکن میرے والدین اس بات کو نہیں سمجھتے، اس لیے میں انھیں بتائے بغیر اسے یہاں لے کر آئی ہوں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا پتا بھی، میری ٹیچر نے ہی مجھے دیا تھا۔ مس کے والد صاحب کا بھی کوئی مسئلہ ہے اور وہ انھی ڈاکٹر صاحب کے مریض ہیں۔ مس، ڈاکٹر صاحب کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ میرے پاس تو ڈاکٹر صاحب کی فیس کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ خیر وہ تو میں نے اپنی دوست سے اُدھار لے لیے ہیں۔ آہستہ آہستہ لوٹا دوں گی۔ لیکن اب مشکل یہ ہے کہ ریسپشنسٹ صاحب نہیں مان رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے چونکہ پہلے وقت نہیں لیا تھا اس

لیے وہ مجھے آپ کے بعد ہی، ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے دیں گے۔'' لڑکی نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

ماہین اُٹھیں، اور استقبالیہ پر جا کر کچھ کہا۔ اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور ماہین واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''بیٹا، پریشان مت ہو۔ جس مریض کو ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے ہیں اس کے بعد تم بھائی کو دِکھا لینا۔ میں اس کے بعد ان سے مِل لوں گی۔''

لڑکی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ ماہین تو اسے فیس کی رقم بھی دینا چاہتی تھیں لیکن اس ڈر سے کہ کہیں بچی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، خاموش رہیں۔

لڑکی نے ماہین کو ایک پمفلٹ دِکھایا جو اس نے استقبالیہ سے لیا تھا۔ لکھا تھا:

'اُداسی ٹھہر جاتی ہے۔'

'مسلسل اُداسی، مایوسی، عدم دلچسپی بات بے بات رونا، نیند ختم، خوشی ختم، سکون ختم، بھوک ختم، نہ گھر اچھا لگے نہ گھر والے، نہ اپنا آپ، موت کی خواہش۔ یہ ڈپیریشن کی بیماری کی علامات ہیں یہ بیماری قابلِ علاج ہے۔'

ڈاکٹر ذیشان احمد

ایم۔بی۔بی۔ایس، ایف۔سی۔پی۔ایس (سائیکاٹری)

(سائیکاٹرسٹ)

''میڈم، یہ تمام علامات میرے بھائی میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے میرے بھائی کو چیک کرنے کے بعد یہ لکھا ہے۔ اس لیے مجھے اُمید ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ دُعا کیجیے گا۔''

اتنی دیر میں پہلا مریض باہر نکل آیا تو استقبالیہ سے اشارہ ملنے کے بعد وہ لڑکی ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں بھائی کو لے کر چلی گئی۔

کافی دیر کے بعد وہ لوٹی تو اس کے چہرے پر بشاشت، صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ استقبالیہ پر گئی تو ریسپشنسٹ نے ڈاکٹر صاحب کا فون سننے کے بعد، فیس کی رقم لڑکی کو واپس کر دی۔ وہ ماہین کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب تو فرشتہ صفت انسان ہیں انھوں نے فیس واپس کر دی ہے بلکہ ادویات کے لیے پیسے بھی دیے ہیں جو میں بالکل لینا نہیں چاہتی تھی لیکن ان کے پُرخلوص اصرار پر انکار نہیں کر سکی۔ اچھا میڈم خدا حافظ۔''

ماہین ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ سر اُٹھا کر مسکرائے۔

نِک سُک سے درست، نہایت اعلیٰ ذوق کے مظہر لباس میں ملبوس، دِلکش شخصیت کی مالک ماہین کو دیکھا اور خوش آمدید کہا۔

ڈاکٹر صاحب کا دِن رات کا واسطہ، نفسیاتی مریضوں سے پڑتا تھا اس لیے انھیں سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ اس سراپا حسین خاتون کی خوبصورت آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی جیسے تپتے صحرا میں دُور دُور تک کوئی جاندار شے نظر نہیں آتی۔

ماہین نے سوشیالوجسٹ کا دیا ہوا پر فارم ڈاکٹر صاحب کو تھما دیا۔

ماہین جہانگیر احمد

عمر 40 سال

ازدواجی حیثیت، شادی شدہ

تعلیم : بی۔اے

مصروفیت : گھریلو خاتون

بچے : ایک بیٹا

ماہرِ نفسیات کے پاس آنے کی وجہ: نیند میں خلل اور مزاج میں ناقابلِ برداشت

بے چینی۔

ڈاکٹر صاحب نے اسے پڑھنے کے بعد، ماہین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مسز ماہین، تفصیلاً بتائیے کہ آپ کیا محسوس کرتی ہیں اور یہ کیفیت کتنے عرصہ سے ہے؟

''ڈاکٹر صاحب میری طبیعت میں اُتار چڑھاؤ آتا ہے۔ کچھ دِن تو ایسے گزرتے ہیں کہ میں اپنی زندگی میں بھرپور دِل چسپی محسوس کرتی ہوں۔ بچپن سے ہی میں شوخ اور چلبلی طبیعت کی مالک ہوں۔ سکول اور کالج کے زمانے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے حیرت ہونے لگتی ہے کہ میں کتنی لاپرواہ، بےفکر اور ہنسنے کھیلنے کی عادی تھی۔ دوستوں میں مقبول اور جانِ محفل۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ مجھ پر اُداسی کے وقفے آنے لگے۔ اپنے روزمرہ سے بے رغبتی اور ماحول سے دُوری، مجھ پر طاری ہونے لگی۔ خوف، وہم اور بے چینی نے طبیعت میں گھر کرلیا۔ میں بہت مثبت سوچ رکھتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ اس پر قابو پاسکوں لیکن ناکامی مجھ میں چڑچڑاپن پیدا کردیتی ہے۔ خوش باش محفل میں بھی، مَیں خود کو اکیلا محسوس کرتی ہوں۔''

ماہین نے اس انداز سے بات کی کہ ڈاکٹر ذیشان جو عمدہ ادبی ذوق رکھتے تھے، انھیں بے اختیار فیضؔ کا شعر یاد آیا۔

؎ چاند جب دُور اُفق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

''مسز ماہین۔۔۔آپ کی گھریلو زندگی؟''

ماہین نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور کوئی جواب نہ دیا۔

''مسز ماہین، آپ اپنی گھریلو زندگی سے مطمئن ہیں؟ مجھے کُھل کر بتائیے۔ یقین مانئے یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔ مریض کے مسائل، ڈاکٹر کی امانت

ہوتے ہیں اور کوئی بھی اچھا ڈاکٹر اس پر کاربند رہتا ہے۔ یہ معلوم کرنا صرف اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ مریض کے ماحول کے بارے میں جان کر ڈاکٹر کو علاج میں آسانی ہوتی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب، یہ شعر میرے حالات کی ترجمانی کے لیے کافی ہے۔

؎ اس شہر کے لوگوں پہ ختم سہی خوش طلعتی و گل پیرہنی
میرے دِل کی تو پیاس کبھی نہ بجھی، میرے جی کی تو بات کبھی نہ بنی

''ھوں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔ں۔''

میری شادی 18 برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔ میرے شوہر ایک بزنس ٹائیکون ہیں۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ لوگ میری قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ میرے سسرال میں صرف ایک جیٹھ اور ان کا خاندان ہے، جو ملک سے باہر ہیں۔ میرے والد، درمیانے درجے کے سرکاری ملازم ہیں۔ اسے خودستائی نہ سمجھیں تو کہوں گی کہ جوانی میں، میں اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی بھی شخص، مجھ سے شادی کرنے کو اپنی خوش قسمتی خیال کرتا۔ جہانگیر نے پہلی بار مجھے کہیں مارکیٹ میں دیکھا ورنہ ان کا اور ہمارا ملنے جلنے والوں کا حلقہ بالکل مختلف تھا۔ پھر انھوں نے کسی طرح سے میرے بارے میں معلومات کیں اور اپنے بھائی کو بطورِ خاص باہر سے بلوایا اور ہمارے ہاں بھیجا۔ انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی پھر بھی ابا میاں نے کچھ روز کی مہلت چاہی کہ وہ اپنے عزیز واقارب سے مشورہ کرلیں۔ میرا، بی۔اے کا رزلٹ میرے ولیمے کے روز آیا۔ ولیمہ کیا تھا رنگ ونور کا سیلاب تھا۔ جب کہ شادی، ابا میاں کی استطاعت کے مطابق ہوئی۔ میرے جیٹھ نے ابا میاں کو سختی سے منع کردیا کہ وہ جہیز کے نام پر کچھ مت بنائیں۔ ولیمے کا اہتمام ایک فائیو سٹار ہوٹل میں کیا گیا۔ میں زیورات اور خوبصورت لباس میں سجی بنی بیٹھی تھی اور لوگ میری خوش نصیبی کی بجائے جہانگیر کی خوش قسمتی کی بات کر رہے تھے۔ جہانگیر، جنھوں نے اتنی چاہت سے شادی کی تھی، شاید انھیں یہ بات نہیں بھائی۔ اسی رات، انھوں نے، مجھ سے بہت تلخ لہجے میں بات کی۔

"تمہارے والدین نے سوچنے کی مہلت کیوں مانگی؟ کیا چاہیے تھا انھیں؟ اس بات سے مجھے اپنی بہت ہیٹی محسوس ہوئی ہے۔ بہرحال۔۔۔ اپنے والدین پر یہ اچھی طرح واضح کر دینا کہ آئندہ میں اس قسم کی کوئی بات برداشت نہیں کروں گا۔"

اور میں جو ہواؤں میں اُڑ رہی تھی، ان کے کرخت لہجے کی چٹان پر گری اور پاش پاش ہوگئی۔

اکثر مجھے جہانگیر کے ساتھ بڑی بڑی پارٹیوں میں جانا پڑتا جہاں لوگوں کی نظریں مجھ پر اُٹھے بغیر نہ رہ سکتیں۔ یہ بات جہانگیر کو گراں گزرتی اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ آئندہ، عام سے لباس میں، سادگی سے پارٹیوں میں جاؤں گی۔ اس پر جہانگیر آگ بگولا ہوگئے۔

"اس طرح، سوسائٹی میں میری بے عزتی کروا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟۔۔۔ میری غربت یا ناانصافی اور ظلم وغیرہ۔"

میرے بال بہت لمبے تھے اگر میں کبھی گیلے بالوں کو کھلا چھوڑ دیتی تو کہتے:

"تمہارے ان 'اوچھے حربوں' سے میں متاثر ہونے والا نہیں۔"

سوتے میں میرے پاؤں یا پشت ان کی طرف ہو جاتی تو وہ قیامت برپا ہوتی کہ الامان۔

ہمارے اختلافات بڑھتے گئے۔ میں نے اپنی سی بہتیری کوشش کی کہ ان کا کوئی حل تلاش کر سکوں لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔

میرے لیے سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگا جب بیٹے کی پیدائش پر انھوں نے سختی سے کہا۔

"بس۔۔۔ مجھے مزید اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ 'درمیانے' طبقے کی خواتین کی طرح تم بچوں میں گھری بیٹھی رہو۔"

درمیانے طبقے کا طعنہ تو مجھے ہر وقت ملتا تھا لیکن یہاں بھی یہ میری راہ میں یوں حائل ہوگا۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

صرف ایک بچہ۔۔۔ تخلیق کے عمل کا دورانیہ میرے خیال میں عورت کے لیے بہت خوبصورت وقت ہوتا ہے۔ اس دوران طبیعت کا خراب ہونا بھی اپنے اندر ایک دِلکش مقصد لیے ہوتا ہے اور اپنے بچے کو نو ماہ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرنے کے بعد جب ماں پہلی بار اسے اپنی گود میں دیکھتی ہے تو جیسے ساری کائنات اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔"

ماہین، خوابیدہ کیفیت میں تھیں۔

"بیٹے کے O-level کرنے کی دیر تھی کہ میرے شوہر نے اسے برطانیہ بھجوا دیا۔ انھیں تو بیٹے کی جدائی نے متاثر نہیں کیا۔ لیکن میرے اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہوگئی اور ادھر میرے بیٹے کو بھی میری پرواہ نہیں ہے۔"

اس پر، ڈاکٹر ذیشان نے پہلی بار، دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ آپ ایسا محسوس کرتی ہیں۔ آپ کا بچہ بھلا آپ سے کیوں دُور ہوگا؟"

"طبعی طور پر تو وہ مجھ سے دُور ہے ہی، ذہنی طور پر بھی میرے پاس نہیں۔ اگر اسے میرا خیال ہے تو وہ اس کا اظہار کیوں نہیں کرتا؟۔۔۔ مجھے اظہار چاہیے۔"

ماہین کے لہجے میں یاس، بے کلی اور سختی تھی۔

"اس کی بڑی وجہ تو، میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹی عمر میں، ایک ایسے معاشرے میں چلا گیا جہاں ایسے رشتوں کی قدر نہیں کی جاتی۔"

"کون کہتا ہے کہ وہاں رشتوں کی پاس داری نہیں کی جاتی۔ وہاں تو چھوٹے سے چھوٹے موقعہ کے لیے وِش کارڈز موجود ہیں لیکن اس نے تو کبھی مجھے وہ بھیجنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ وہ ویسے ہی باپ پر گیا ہے۔ جس کے پاس پاکستان میں رہ کر بھی میرے

لیے وقت نہیں ہے اور تنہائی کا درو دیوار کو چاٹتا ہوا یہ زہر ایک روز مجھے ختم کر ڈالے گا۔''

''آپ تنہا نہیں ہیں مسز ماہین۔ آپ کے شوہر، بیٹا، آپ کا میکہ، کلب اور سب سے بڑھ کر کتابیں۔۔۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کتابیں پڑھنے کی شوقین ہیں۔۔۔ اور میکے میں بھی آپ فون پر بات تو کر ہی لیتی ہوں گی؟''

''نہیں کرتی۔۔۔ میں اپنے شوہر کو باتیں بنانے کا موقعہ نہیں دینا چاہتی اور یوں بھی کسی وقت انجانے میں یا جذباتی ہو کر میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے میرے والدین پریشان ہوں۔''

''اور آپ کی دوست؟''

''ہنہ۔۔۔ بے تحاشہ امیر خواتین کے پاس بات کرنے کے بہت کم موضوع ہیں۔ فیشن، میک اَپ، جیولری اور۔۔۔ چغلیاں۔۔۔ میں زیادہ تر خاموش رہتی ہوں۔۔۔ مجھے معلوم ہے میرے پیٹھ پیچھے وہ میری بہت برائیاں کرتی ہوں گی۔۔۔ 'مڈل کلاس کی ہے اس لیے ہم لوگوں میں گھل مل جانے کا اعتماد نہیں ہے۔۔۔ یا یہ کہ پیسہ مل جانے پر مغرور ہو گئی ہے۔ اور ایسی ہی خرافات۔۔۔''

ماہین کے لہجے میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''مسز ماہین اگر آپ کا بیٹا پاکستان نہیں آتا تو آپ تو اس کے پاس ملنے کے لیے جا سکتی ہیں نا! مالی لحاظ سے آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''گئی تھی ایک بار۔۔۔ ماحول کی اتنی بڑی تبدیلی نے مجھ پر اُلٹا اثر کیا۔ میری تنہائی یہاں کی نسبت دو چند ہو گئی۔ میرا بیٹا سارا وقت گھر سے باہر رہتا اور دوسرے، تیسرے روز اپنے بے ہنگم دوستوں اور عجیب و غریب لڑکیوں کو گھر لے آتا پھر یہ سب مِل کر ڈرنک کرتے اور ناچتے، ویسے اسے ناچ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ رقص تو اعضا کی شاعری ہے اور وہ بلاوجہ کی اُٹھا پٹخ کو رقص کا نام دیتے ہیں۔ مَیں تو پندرہ دِن کے بعد ہی وہاں سے بھاگ لی۔

اس پاگل خانے سے تو یقیناً میرا گھر بہتر ہے جسے آپ نیم پاگل خانہ کہہ سکتے ہیں۔ میرا بیٹا شاید اِسی سے فرار چاہتا ہے اور واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔''

ڈاکٹر ذیشان بے اختیار مسکرائے۔

''کیا نام رکھا ہے آپ نے مسز ماہین!۔۔۔ نیم پاگل خانہ۔۔۔ میرا خیال ہے آپ اپنے خیالات و احساسات کو کاغذ پر منتقل کیا کریں۔ آپ خود کو بھی ہلکا پھلکا محسوس کریں گی اور یقیناً ایک خوبصورت تحریر بھی سامنے آئے گی جو آپ کے لیے طمانیت کا باعث بنے گی۔''

''کوشش کروں گی لیکن وعدہ نہیں کرتی۔ آپ فی الحال مجھے کوئی دوا دے دیں۔ جس سے میں کم از کم رات کو تو اپنا آپ اور اپنے ماحول کو بھول کر سکون کی نیند لے سکوں۔''

اچانک ماہین کے لہجے میں بیزاری اُتر آئی۔

''ٹھیک ہے مسز ماہین، رات کو سونے سے پہلے شاور لیجیے، ڈھیلا لباس پہنیے پھر دوا کھانے کے بعد اپنے ذہن کو خالی رکھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ پُرسکون نیند سو جائیں گی اور پھر ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ آئیے۔''

''یہ سب کر کے دیکھ چکی ہوں، سوائے دوا کے۔۔۔ دیکھتی ہوں اب یہ کیا معجزہ دکھاتی ہے؟''

ماہین کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ طنز بھی شامل تھا۔

اگلے ہفتے، ماہین اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی یہاں موجود تھیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے انھیں دیکھا تو ان میں پہلے کی نسبت واضح بہتری تھی۔ نیند کی کمی پوری ہونے اور ذہنی سکون نے ان کے چہرے کو شگفتگی بخشی تھی۔ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈاکٹر ذیشان نے محسوس کیا کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کا session تقریباً ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ اس

ملاقات سے ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ اگر مسز ماہین اسی طرح بہتر ہوتی رہیں تو وہ یقیناً حالات سے مطابقت پیدا کر کے زندگی کی طرف لوٹ آئیں گی۔

پھر ماہین، ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق، ہر ہفتہ پابندی سے آنے لگیں۔

ڈاکٹر ذیشان نے ان میں کتابیں پڑھنے کا شوق دوبارہ اُجاگر کر دیا، جو ان میں غیر شادی شدہ زندگی میں تو موجود تھا لیکن پھر کچھ مجبوراً اور کچھ طبیعت میں اُداسی کا عنصر آ جانے سے دب گیا تھا۔

ماہین نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تھا کہ جہانگیر احمد، گھر میں کوئی کتاب دیکھ لیتے تو دھاڑتے۔

''یہ گھر ہے یا لائبریری۔۔۔ میری محنت کی کمائی تم ان خرافات پر اُڑا دیتی ہو۔''

''خرافات؟؟؟'' ماہین حیران رہ جاتیں۔ انھیں اپنے شوہر کا رویہ سمجھ میں نہ آتا کیونکہ زیورات اور کپڑوں، جوتیوں کی مَد میں صرف کیے جانے والی رقم کا حساب انھوں نے کبھی نہیں مانگا تھا۔ اب وہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈھیروں کتابیں خریدنے لگیں، جنھیں وہ جہانگیر احمد کی نظروں میں آنے سے بچا لیتیں۔

ایک روز انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا ''ڈاکٹر صاحب یہ بھی تو بددیانتی ہوئی نا کہ میں کتابیں چھپا کر پڑھتی ہوں۔ میرے ذہن پر بوجھ رہتا ہے۔''

''نہیں، مسز ماہین۔'' ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر وہی مہان مسکراہٹ اُبھری جو ان کی دِلکش شخصیت کا حصہ تھی۔

''آپ نے سنا نہیں یہ عالمی مقولہ ہے کہ جنگ، محبت اور کتابوں کے پڑھنے میں ہر بات جائز ہے۔''

اس پر ماہین دِل کھول کر ہنسی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ
'صحراؤں میں ہولے سے بادِ نسیم چلنے لگی ہے۔'

(اس لیے اب بیمار کو بھی قرار آ جائے گا۔)

اس عرصہ میں، انجانے میں، ماہین اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان بے تکلفی در آئی۔

ایک روز ماہین نے ڈاکٹر صاحب کے خانگی حالات کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا۔

''مسز ماہین، میری شادی ہوئی تھی۔ میری بیوی ایک آئیڈیل خاتون تھی۔ لیکن ہمارا ساتھ بہت کم عرصہ رہا۔ پہلی بچی کی پیدائش پر ماں بیٹی دونوں زندگی کی بازی ہار بیٹھیں اور مجھے تنہا کر گئیں۔''

''اس کے بعد۔''

''اس کے بعد۔۔۔ میں آپ کے سامنے ہوں۔۔۔ اکیلا۔۔۔ تنہا۔۔۔ لیکن

ع متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

دراصل اس تمام عرصہ کے دوران مجھے کوئی ایسی خاتون نظر نہیں آئی جو میری بیوی کی جگہ لے سکے، سوائے۔۔۔''

ڈاکٹر صاحب کے معنی خیز انداز کو سمجھ کر ماہین نے یک لخت موضوع بدل دیا۔ آنکھیں چُرا لیں اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔

ایک روز ماہین اپائنٹمنٹ کے بغیر چلی آئیں۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح خوشبوؤں میں نہائی ہوئی قیمتی اور اعلیٰ لباس اور بہت خوبصورت ہلکے پھلکے زیورات، شوخ رنگ کی لپ اسٹک لگائے۔ ڈاکٹر ذیشان نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ پریشان ہیں کیونکہ وہ کہتی تھیں ''میں جتنا زیادہ پریشان ہوتی ہوں اتنا زیادہ اہتمام سے تیار ہو کر نکلتی ہوں۔۔۔ خود کو بھی دھوکہ دیتی ہوں اور دوسروں کو بھی۔'' لیکن آنکھوں کی ویرانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''کیسی ہیں مسز ماہین آپ؟''

ڈاکٹر صاحب کی بات کے جواب میں ماہین نے خلافِ معمول تلخ لہجے اور بلند آواز میں کہا۔

''کیسی ہوسکتی ہوں؟ کیسی لگ رہی ہوں؟۔۔۔ڈاکٹر صاحب آج میں آپ کو وہ بات کہوں گی جو میں نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔۔۔اور وہ یہ ہے کہ میں کبھی بھی صحت مند نہیں ہو پاؤں گی۔''

''آپ کیوں مایوسی کی بات کرتی ہیں مسز ماہین؟ آپ تو بہت باہمت خاتون ہیں۔آپ آج کیوں حوصلہ ہار بیٹھی ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں بہت باہمت ہوں۔میں شاید بظاہر دِکھائی دیتی ہوں لیکن اندر سے بہت کمزور اور کم حوصلہ ہوں اور پھر دوسری بات یہ کہ اگر شوگر کے مریض کو انسولین کی کافی مقدار دی جائے لیکن ساتھ ساتھ وہ سارا دِن چینی پھانکتا رہے۔تو کیا وہ کبھی ٹھیک ہوسکتا ہے؟ یا یوں کہیے کہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض دوا لینے کے ساتھ ساتھ نمک کا بے تحاشہ استعمال کرے تو وہ کیسے صحت یاب ہوگا؟ یہ سب کتابی باتیں ہیں جب تک میرے حالات ٹھیک نہیں ہوں گے تب تک ادویات اور میرا حوصلہ بے کار ہے۔ میں نے آج تک مثبت انداز سے ہی سوچا ہے لیکن اب اور نہیں۔۔۔مجھ میں ہمت نہیں۔۔۔ میں حوصلہ ہار بیٹھی ہوں۔۔۔''

وہ اچانک کرسی سے اُٹھیں اور واپس جانے کے لیے دروازے تک پہنچیں پھر پیچھے مڑ کر کہنے لگیں۔

''میں چاہتی ہوں کہ اس بندی خانے کی سلاخیں توڑ کر آزاد ہو جاؤں۔''اس سے پہلے کہ ڈاکٹر ذیشان کچھ کہتے وہ تیز تیز چلتی ہوئی اپنی گاڑی تک پہنچیں اور چلی گئیں۔

ڈاکٹر ذیشان حیران سے کھڑے رہ گئے۔

پھر انٹرکام پر انھوں نے استقبالیہ سے معلوم کیا کہ کوئی اور مریض تو نہیں ہے اور جواب نفی میں ملنے پر وہ گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔

گھر جا کر انھوں نے ماہین کا نمبر ملایا لیکن موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔

رات گئے انھوں نے ماہین کو sms کیا۔

''میں بندی خانے کی سلاخیں ٹوٹنے کا انتظار کروں گا۔''

اگلے روز ڈاکٹر صاحب نے بارہا فون ملانے کی کوشش کی۔فون کھلا تھا لیکن ماہین کال کاٹ دیتی تھیں اس پر ڈاکٹر صاحب نے خود کو سمجھایا کہ یہ چھوٹا سا معاملہ نہیں ہے۔ ماہین کو فیصلہ کرنے کا وقت دینا چاہیے۔بہرحال وہ ماہین کی نظروں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکے تھے۔اِس لیے بہت پُراُمید تھے۔

تین روز ڈاکٹر ذیشان پر بہت بھاری گزرے۔فون کھلا ہونے کے باوجود ماہین کال اٹینڈ نہیں کررہی تھیں وہ اپنے موبائل کی بیل پر چونک اُٹھتے اور جھپٹ کر اسے اُٹھاتے لیکن کسی اور کا نمبر دیکھ کر جھنجھلاتے اور کال کاٹ دیتے۔موبائل پر sms کا اِشارہ پا کر بھی اسی طرح ہوتا۔آخر تیسری شام کو میسج کی ٹون سن کر انھوں نے موبائل اُٹھایا۔لکھا تھا One new sms مسز ماہین جہانگیر احمد۔ڈاکٹر صاحب نے بے تابی سے کھولا۔لکھا تھا:

؎ اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

بہت زور کا زلزلہ آیا۔ڈاکٹر صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہی گھر کی عمارت کے ملبے تلے دب گئے ہیں۔بوجھ اور گرد و غبار سے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔کافی دیر اسی کیفیت میں گزری۔کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے تو پہلا خیال ان کے دِل میں یہ آیا کہ وہ ریسپشنسٹ سے کہیں گے کہ آئندہ مسز ماہین کو اپائنٹمنٹ نہ دے۔وہ اِن کا سامنا نہ کر پائیں گے۔لیکن اِس کا موقعہ ہی نہ آیا۔کیونکہ اسی رات کے کسی پہر میں مسز ماہین جہانگیر احمد بندی خانے کی سلاخیں توڑے بغیر آزاد ہو گئیں۔انھوں نے بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں نگل لی تھیں۔

□□□

گلوبل وارمنگ

گلوبل وارمنگ نے تو موسموں کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے ورنہ سبھی گاؤں والے جانتے تھے کہ کب کیسے دِن آئیں گے؟ پروا بہتی تو کہرا جمتا۔ بسنت آتی، سرسوں پھولتی تو پالا اڑنت ہو جاتا۔ پوہ کی دُھپ میں ہڈیوں کی مِخ تک جم جاتی۔ ساون میں جمعرات کو بارش شروع ہوتی تو یہ جھڑی پورا ایک ہفتہ چلتی۔ بوندیں زمین پر گر کر چھوٹے چھوٹے بلبلوں میں تبدیل ہونے لگتیں تو گاؤں والے گھروں کی چھتوں کو دیکھنے بھالنے لگتے کیونکہ یہ رَجویں بارش کوٹھوں کا بیڑا غرق کر دیتی۔ اور تو اور موسم خبریں بھی دیتے تھے۔ لال ہنیری آتی تو ماں جِیناں اپنی چندھی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتی اور بُڑبُڑاتی۔

''ہک ہا۔۔۔ پتا نہیں کس ماں کا بے گناہ لعل قتل ہوا ہے۔ لوگ خدا کے قہر سے نہیں ڈرتے۔''

واورولا آیا تھا تو چھپڑ کا پانی ہَوا میں اُٹھ گیا تھا اور پھر ایسے گھوما تھا کہ سارے گاؤں پر پانی کے موٹے موٹے چھینٹے برسے تھے۔ ولی محمد کی یوگ اس کے سامنے اُڑ کر کرم دِین کے کھیتوں میں جا گری تھی۔ سارے گاؤں کے چھپرے اُڑ کر تیلی تیلی ہو کر بکھر گئے تھے۔
تب ماں جِیناں نے سجدے سے سر اُٹھا کر کہا تھا۔

''گاؤں پر مُٹھ چلی ہے۔ نہ جانے کون نامراد اتنا گناہی ہے سارے پنڈ کو برباد کرا دیا۔''

رجو کے چھوٹا سا گاؤں تھا۔ محبتی لوگ تھے، اپناپن لیے ہوئے۔ ایک دوسرے کے ساتھ پیار بانٹتے ہی گزرتی جا رہی تھی۔ ہاں البتہ، دو مربّعے کے فاصلے پر واقع اکاں پنڈ کے سالانہ میلے پر تین گاؤں اکٹھے ہو جاتے تو بہت شور شرابا ہوتا۔

میلے سے ایک ہفتہ پہلے ہی گاؤں والے اپنی لاٹھیوں کو تیل پلانا شروع کر دیتے اور میلے پر ان کی لاٹھیاں اور مونچھیں برابر چمک رہی ہوتیں۔

میلہ دو دِن کے لیے لگتا اور جب ختم ہونے کو ہوتا تو کوئی جان بوجھ کر کسی دوسرے کو کندھا مار جاتا۔ یہ دراصل جھگڑے کے آغاز کا سگنل ہوتا۔ کچّے برتن ٹھن ٹھن کر کے ٹوٹتے۔ کھلبلی مچ جاتی۔ تیل پلائی ہوئی لاٹھیاں مار پیٹ کے علاوہ بھی بہت کام آتیں۔ بڑے بڑے کڑاہوں میں جلیبیاں تلی جا رہی ہوتیں کہ کوئی جی دار ان کے کُنڈوں میں اپنی لاٹھی پرو دیتا اس کا ساتھی دوسری طرف سے اس لاٹھی کو پکڑتا اور یوں دونوں میلے سے رُخصت ہوتے۔ گرم گھی میں ڈالی ہوئی جلیبیاں اسی طرح تلی جا رہی ہوتیں۔ کئی گھروں میں ایسے کڑاہے موجود تھے جو ناند کا کام دیتے اور کٹڑے بچھڑے اس میں چارہ کھاتے۔

میلہ ختم ہو جاتا تو عورتیں سکھ کا سانس لیتیں ورنہ سہم سا رہتا کہ ربّ جانے گل کہاں مُکّے گی؟ حالانکہ آج تک خیر ہی گزری تھی بس سہہ سہا معمولی سر پھٹول ہوتی کیونکہ یہ تو نرا شغل میلہ ہوتا تھا اور نہ جانے کب سے اسی طرح چلا آ رہا تھا۔

لیکن پھندی کو اس سب سے کچھ غرض نہیں تھی۔ اسے اکاں والے میلے میں دھمچڑ مچانے کا کوئی شوق نہیں تھا اور شادی کے بعد تو وہ ہر وقت چھانو کے ہی خیالوں میں رہنے لگا تھا۔

وہ لمحہ پھندی کی آنکھوں میں جم گیا تھا جب وہ چھانو کو بیاہ کر لایا تھا تو ماں جِیناں نے گھر کی دہلیز پر تیل گرا کر دونوں کو اندر داخل ہونے دیا تھا۔ پھندی کے باپ کے مرنے

کے بعد آج پہلی بار، ماں جیناں نے سونفیا رنگ کا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ اس کے گال خوشی سے گلابی ہو رہے تھے اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے جوانی کی بیوگی کے سارے دُکھ بھلا دیے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں عورتوں کے جھرمٹ میں چھانو سر جھکائے کھڑی تھی۔

ماں جیناں پیتل کے لوٹے میں پانی لے کر آئی اور مانتے پھوپھی نے پھندی کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ تو چھانو سے ٹکرا ہی گیا تھا۔

"ذرا پاس ہو جا۔ تجھے کاٹ نہیں لے گی۔"

عورتیں کھلکھلائیں۔

"باہر نکل بنّے دیئے مائے
بنّا باہر کھڑا"

لٹکتی ہوئی لے میں سب گانے لگیں۔ ماں جیناں نے پانی کا لوٹا دونوں کے سر سے وارا۔

کسی نے اُونچی آواز میں ہدایت دی تھی۔

"پھندی، ماں کو پانی نہ پینے دینا۔"

اور پھر ماں نے ساتویں پھیرے میں آخر لوٹے کو منہ لگا ہی لیا۔ پھندی نے ماں کو روکنے کی کوشش کی تو ایک دم سب بول اُٹھیں۔

"پینے دے۔۔۔ اب پینے دے۔"

گویا یہ سارا ڈراما پہلے سے طے شدہ تھا۔ اسے ایسے ہی ہونا تھا لیکن جب لالٹین کی لَو اُونچی کر کے، کسی نے دُلہن کے منہ کے پاس کی اور ماں جیناں نے سرخ پھلکاری میں لپٹی، ڈلکیں مارتی کچے سونے کی ڈلی جیسی چھانو کا ماتھا چوما تو ایک لمحے کے لیے، مکھن میں

گندھے چاند جیسے رنگ والے چہرے پر سونے کی نتھ اور سک ملے ہوئے، نارنجی رنگ کے بھرے بھرے ہونٹوں کا نظارہ پھندی کو ڈھیر کر گیا۔ چھانو ذرا سا لڑکھڑائی تو اس کے پراندے میں لگے پاؤ بھر چاندی کے بور چھنک اُٹھے۔ پھندی کا دِل، ان کی دُھن پر ناچنے لگا۔

عورتیں گا رہی تھیں۔

"باہر نکل سسّڑیئے گھر میرا
تو کھالیا تھیرا
ہُن رہندا کھوندا میرا۔"

تو پھندی نے سوچا ماں کو باہر نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ چھانو میرے دِل میں رہے گی۔ وہ تو اس کے پورے وجود پر قابض ہو گئی تھی۔ دیواروں میں بھلا کیا رکھا تھا؟ ماں جیناں نے چھوٹی سی چھابی میں ناریل کی ٹھوٹھی، پتاسے اور مکھانے رکھ کر چھانو کو گیارہ روپے سلامی ڈالی تو اردگرد کھڑی لڑکیاں، چھانو کے نصیب پر رشک کرنے لگیں۔ اکٹھے گیارہ روپے کس نے دیکھے تھے؟

ماسی رحمتے ایک بڑی سی پرات میں آٹا لے آئی۔ پھر پھندی اور چھانو کو پیڑھیوں پر بٹھا کر، پرات درمیان میں رکھ دی۔

"وے پھندی، اس آٹے میں ایک روپیہ پڑا ہے۔ دیکھنا ہے اسے تو ڈھونڈتا ہے کہ وہٹی۔ ویکھیں مار نہ کھا جائیں۔"

لڑکیاں بلاوجہ ہنس رہی تھیں۔

پھندی نے آٹے میں ہاتھ ڈالا ہی تو روپیہ اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن چھانو کے ہاتھ کو بار بار چھونے کے چاؤ میں اس نے ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ روپیہ تو اسے پہلے ویلے ہی مِل گیا تھا۔ چھانو کے مہندی رچے ہاتھ چمکارے مار رہے تھے۔ اس کی کلائیوں میں بندھے کلیروں کے رنگ برنگے پھندنے، میوے اور کوڈیاں خشک آٹے میں سَنی جا

رہی تھیں۔

"وے پھندی تو تو سچی مچی روپیہ ڈھونڈنے لگ گیا ہے۔ ووہٹی کے ہاتھ میں آنے دے۔ برکت ہوتی ہے رزق عورت کی قسمت کا ہوتا ہے۔ گھر بھرا رہے گا۔"

پھندی نے بادلِ نخواستہ روپیہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ گھر میں پہلے ہی کس چیز کی کمی تھی؟

"ماسی بھی نا بس ایویں ہی مارتی ہے۔"

اب چھانو کے لیے کیا مشکل ہونا تھی۔ اس نے روپیہ باہر نکالا تو سب ہنسنے لگیں۔

پھندی کو ان کے بلاوجہ ہنسنے سے چڑ آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ چھانو ہو، خاموشی ہو اور وہ ہو۔

پھر ماں جیناں نے مکھن میں دیسی کھانڈ ملا کر چھانو کے ہونٹوں کو چھوائی تو اس نے گھونگھٹ کے اندر ہی ماں کی اُنگلی ہولے سے کاٹ لی۔ ماں جیناں کو اس کی توقع نہیں تھی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ جلدی سے پیچھے کھینچا تو چھانو ہولے سے ہنسی اور پراندے کے بور اور ہنسی کے گھنگھرو بج اُٹھے۔

چاچی حاجراں نے پھندی کو ٹہوکا دیا۔

"وے پھندی ووہٹی تو بڑی شرارتی ہے۔ سانبھ بھی لے گا؟"

اور پھندی جو ابھی تک خود کو ہی نہیں سانبھ سکا تھا، چھنّے میں لڑھکتے کچ کے بنٹے جیسی آواز والی ہنسی سن کر بالکل ہی ہوش وحواس کھو بیٹھا۔۔۔ اور پھر چھانو گھر میں رچ بس گئی۔ ماں جیناں کو تو وہ کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی، سوائے مِسّی روٹی کی فرمائش کے۔ ماں، انار دانے اور پودنے کی چٹنی بناتی تو چھانو کہتی۔

"ماں ہری مرچیں واھوا ساری ڈالنا۔"

ماں مصالحے دار مِسّی روٹی، تندوری میں سے گرم گرم اُتارتی، اُوپر ڈھیر سارا مکھن رکھتی اور جب چھانو چٹنی کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھاتی تو اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہتی۔

"دھیئے، کا کا تو بڑا ہی چسکورا ہے۔"

ماں کو اس بن ماں باپ کی بچی سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ وہ تھی بھی اسی قابل۔۔۔ نکھّی اور چلبلی۔

پھندی نے چھانو کی کوکھ میں تو جگہ بنا لی تھی لیکن دِل تک نہ پہنچ سکا پھر بھی گزارا چل رہا تھا۔ اس دِن تک، جب تک حاکم علی نے گھر کے ساتھ ساتھ چھانو کے دِل کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔

سنسان دوپہر میں، بکائن کی ٹھنڈی چھاؤں تلے، چھانو، کاکے کو دُودھ پلاتے پلاتے، اس کے ساتھ ہی سو گئی۔ ساتھ والی منجی پر ماں جیناں پکّھی جھلتے جھلتے، اسے منہ پر رکھ کر اُونگھ رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چھانو نے جلدی سے قمیص ٹھیک کی۔ کاکے کو اُٹھا کر ماں جیناں کے ساتھ لٹایا اور پراندے کے بور چھنکاتی، دروازہ کھولنے چلی گئی۔

"ماں جیناں سے ملنے آیا ہوں۔۔۔ حاکم علی۔"

دروازے کی درز سے لال کنّی والا لاچا نظر آیا۔ بھاری سی اجنبی آواز۔۔۔ یہ کون تھا؟۔۔۔ پہلے تو اس کی آواز کبھی نہیں سنی۔۔۔

چھانو نے دروازہ کھولا تو حاکم علی سر جھکا کر بمشکل دروازے میں سے گزرا۔

"پھندی تیرا دروازہ کسی دِن میرا سر لاہ لے گا۔"

حاکم علی کہہ کر خود ہی ہنسا تھا اور جب اس نے سر اُٹھایا اور چھانو کو نگاہ بھر کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نیند سے بوجھل، گلابی ڈوروں والی بڑی بڑی آنکھوں پر بھاری پلکوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ چھانو اس کے دِل میں ککلی ڈالنے لگی۔

چھانو نے بھی جب اس اُچّے شملے، لمبے قد اور صحت مند سانولی رنگت والے اجنبی جٹ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تو لڑکھڑا گئی۔ اس کے گلے میں سونے کا انعام اور تویتڑیاں چمک رہی تھیں، وہ تیز تیز چلتی اسے ماں جیناں کے پاس چھوڑ کر دودھ کا چھنّا لینے چلی گئی۔

"ماں۔۔۔ یہ پھڑ لے۔"

اب چھانو نے نہ جانے کیوں، دوپٹہ ماتھے تک کھینچ کر پلّو سے منہ آدھا ڈھک لیا تھا۔شاید وہ اس انجان پروہنے کی مستانی آنکھوں کے ٹُونے سے بچنا چاہتی تھی۔۔۔ پر کہاں۔۔۔؟

"لے آ دھیئے۔اے حاکم علی ہے۔ پھندی کی ماسی کا پُتر۔۔۔میرا بھنوا۔۔۔ بار میں اپنے چاچے کی زمین آباد کروانے گیا ہوا تھا۔کوئی ڈوڑھ سال بعد لوٹا ہے۔"

چھانو، چھنّا پکڑا کر انھی پیروں، دالان میں واپس چلی گئی۔تھوڑی دیر بعد کاکا بلک کر رویا تو ماں نے اسے آواز دی۔

"چھانو دھیئے کاکا رو رہا ہے۔"

چھانو بھاگتی ہوئی آئی۔ حاکم علی مونچھوں تلے بنا بنا ہنس رہا تھا۔آنکھیں شرارت سے ناچ رہی تھیں۔ یہ تو اس نے بعد میں چھانو کو بتایا تھا کہ اس نے اسے بلانے کے لیے کاکے کو چٹکی کاٹی تھی۔

"بے غیرتا۔۔۔میرے کاکے کو رُلا دیا تھا تو نے۔"

چھانو نے ٹھنکتے ہوئے اسے آنکھیں دِکھائی تھیں۔

پر رُلا تو اصل میں حاکم علی نے پھندی کو دیا تھا۔ چھانو میں بڑی تبدیلی آئی تھی۔اب تو بسنتی چوڑی گرنی ہر پندرھواڑے اس کے گھر آنے لگی تھی۔ چھانو کی گول گول کلائیوں میں پھنسی، سرخ سنہری چوڑیوں کا رنگ ابھی ماند بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ بسنتی کو سنیہا بھیج دیتی۔کاکے کے بعد سک سرمے پہ بھی توجہ کم ہوگئی تھی۔اب باقاعدگی سے اِستعمال کرنے لگی۔کبھی اکیلے میں مسکرا دیتی۔کام شام کرتی، گنگناتی رہتی۔

'وے ماہیا تیرے ویکھن نوں
چرخا پچھلی گلی دے وِچ ڈاہواں

تے لوکاں بھانے میں کتدی
تند تیریاں یاداں دے پاواں'

لیکن پھندی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر جلتے دِیے بجھ جاتے۔اس کی بات کے جواب میں یوں تنک کر 'اونہہ' کرتی کہ پھندی کا دِل بیٹھ جاتا۔

"میرے ساتھ اِنج نہ کر چھانو۔"

اگر چہ اس کے دِل کی فریاد، ہونٹوں تک نہ آتی۔جب وہ چونترے پر روٹی کھانے بیٹھتا تو اس کے سامنے پڑے ہوئے چھابے میں چھانو، جلی ہوئی روٹی یوں گھما کر پھینکتی جیسے کتے کو ڈال رہی ہو۔اور جواب میں وہ زخمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا تو چھانو کے چہرے پر بڑی واضح حقارت نظر آتی۔

"میں اس کی جگہ ہوتی تو روٹی کو گھما کر پھینکنے والی کلائی اس زور سے پکڑتی کہ چوڑیاں کچ کا ڈھیر بن جاتیں۔۔۔نمرد کہیں کا۔" (اسے حاکم علی کے ہاتھ کی مضبوط گرفت یاد آجاتی۔)

"ایسا مسکین بندہ بھلا کس کام کا۔"

چھانو دِل ہی دِل میں پھندی کو کوستی۔

رات بڑی ہنیری تھی۔پھندی نے آج رات کھوہ جوڑنا تھا۔مکئی کو پانی لگانا تھا۔وہ تیسرے پہر واپس آیا تو دروازہ کھڑکانے سے پہلے ہی اسے بڑک آئی جیسے ویہڑے میں کوئی ہے۔پھر تیز تیز قدموں کی آواز آئی اور کسی نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی۔اس نے لالٹین اُونچی کی تو جانے والے کا انعام اور توتیڑیاں چمکیں اور ویہڑے میں چاندی کے بور چھنکے۔ٹھنڈی رات میں وگدی پُرے کی ہوا میں بھی پھندی کو پسینہ آ گیا۔

"او ربا میریا، ایہہ کی ہوگیا۔"

اس نے بمشکل دروازہ کھٹکھٹایا تو چھانو پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دروازہ

کھول کر واپس اپنے بستر پر یوں گر گئی جیسے ابھی تک نیند میں ہو۔

پھندی کی چپ نے چھانو کو پھر سے شیر کر دیا۔ اب تو وہ اس کی طرف حقارت سے دیکھ کر تھوک دیتی۔

پھر اکاں والے میلے کی تیاریاں شروع ہو گئیں گاؤں والوں نے اپنی اپنی لاٹھیوں کو تیل پلانا شروع کر دیا تھا۔

حاکم علی اپنی لاٹھی کو تیل سے سنے ہاتھوں میں لے کر چومتا اور گنگناتا۔

'چل چلیے اکاں والے میلے
مُنڈا تیرا میں چک لئوں
نی جند میریئے'

پھندی بھی لاٹھی کو تیل چُپڑ رہا تھا تو ماں نے تعجب سے پوچھا:

"کاکا۔۔۔تو بھی؟"

"ہاں ماں۔۔۔میں بھی۔"

اور پھر پھندی نے لاٹھی ایسے گھمائی جیسے سرخ اور سنہری چوڑیوں والی کلائی، جلی ہوئی روٹی گھماتی تھی۔ میلا پہلے ہی روز اُجڑ گیا تھا۔ لال ہنیری زور سے اُٹھی تھی۔ سب کچھ دُھندلا گیا تھا۔ لیکن قتل ہونے والا ماں کا لعل بے گناہ نہیں تھا۔

لگتا تھا پنڈ میں جن پھر گیا ہے۔

حاکم علی کی منجی صحن میں پڑی تھی۔ اس کا لال کنی والا لاچا اور کالا کرتا خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ گلے میں سونے کا انعام اور تویتڑیاں اسی طرح چمک رہی تھیں۔ سر کے پچھلے حصے سے بہنے والا خون راستہ بدل کر کپڑوں میں جذب ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤں منجی سے گِٹھ گِٹھ باہر لٹک رہے تھے۔

"لوڑھا آ گیا ہے۔ کبھی سنا تھا کہ قتل ہونے والا گناہ گار ہو پھر بھی لال ہنیری آئے۔"

ماں جیناں کے حساب سے اس کا پھندی، اس کا فرزند علی بے گناہ تھا۔ گاؤں والے بھی ماں جیناں کی بات کو صحیح سمجھتے تھے۔ پھر بھی پھندی کو پکڑ کر نمبردار کے حوالے کر آئے۔ اس نے چوکیدار بھیج کر پولیس بلوالی۔ جب فجر کے وقت تھانیدار پھندی کو لے کر جا رہا تھا تو سارا گاؤں جمع تھا۔

ماں جیناں کُرلائی۔

"آج واورولا تو نہیں آیا پر میرا چھپر تو تیلی تیلی ہو کر کھلر گیا ہے۔ پھندی تو دیکھتا کیوں نہیں؟ تیلیاں چُن لے میرا پُتر۔"

ماں جیناں نے زور سے سینے پر دو ہتڑ مارے اور گر گئی۔ پھندی نے ماں کا سر گود میں رکھا تو اس نے آخری سانس لی۔

پھندی کسی معمول کی طرح تھانیدار کے ساتھ چل دیا۔ چار قدم جا کر واپس مُڑا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی چھانو کے پاس آیا اور اس کی کلائی اس زور سے پکڑی کہ لال سنہری چوڑیاں کچ کا ڈھیر بن گئیں۔

آج رجو کے پنڈ میں گلوبل وارمنگ کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ لال ہنیری آئی تھی لیکن قتل ہونے والا ماں کا لعل بے گناہ نہیں تھا۔ واورولے کے بنا ہی ماں جیناں کا چھپر تیلی تیلی ہو گیا تھا۔

□□□

بِزت

’مرزے‘ کی ’صاحباں‘ کو تو کسی نے دیکھا نہیں تھا لیکن مند پور کی صاحباں کو جو دیکھتا، پلک جھپکنا بھول جاتا۔ پندرہ سالہ صاحباں جب اُوپر تلے دو گھڑے، پانی سے بھرے ہوئے اُٹھا کر چلتی تو اس کی کمر کے لچکنے کے ساتھ ساتھ لگتا کہ سارا ماحول ہلکورے لے رہا ہے۔ لڑکے بالے اِدھر اُدھر بیٹھ کر اس کی ہی باتیں کرتے، لیکن اتنی چھوٹی عمر میں بھی اس کے چہرے پر وہ تمکنت تھی کہ اسے مخاطب کرنا تو دُور کی بات تھی، کوئی آوازہ کسنے کی بھی جرأت نہ کر پاتا۔

اور پھر سوہنے ربّ کو یہ منظور ہوا کہ ساتھ کے گاؤں اکھاڑے سے جمال علی کا رِشتہ صاحباں کے ساتھ طے ہو گیا۔ لڑکے ’جمالے‘ کے نصیبوں پر رشک کرتے اور صاحباں کی سہیلیاں صاحباں کے نصیبوں پر۔ جمالا اپنی ماں کا اکیلا بیٹا تھا اور ڈیڑھ مربع زمین کا وارث۔ صاحباں کے تو عیش ہی عیش تھے۔ ربّ کے نام والی ساس اور پیار کرنے والے خاوند کے ساتھ ڈھیروں پیسہ جو جمالا اس کے لیے بے دریغ خرچ کرتا۔

لیکن یہ عرصہ زیادہ لمبا نہیں تھا جس میں ہر چیز ٹھیک تھی۔ شادی ہونے کے ایک ماہ بعد ہی عورتوں نے صاحباں کے سانسوں کو غور سے دیکھنا اور اس کی چال کو پرکھنا شروع کر

دیا جب کچھ سمجھ میں نہ آتا تو امّاں سے ہاتھ اور آنکھ کے اِشارے سے سوال کرتیں۔ جواب میں امّاں مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیتی۔

دھیرے دھیرے یہ ہاتھوں اور آنکھوں کے اِشارے زبان پر آنے لگے۔ سرگوشیاں اور کھسر پھسر واضح الفاظ میں بدل گئی۔

رفتہ رفتہ نسخے بتائے جانے لگے پھر ان نسخوں کو آزمانے کی باری آ گئی۔ دُعائیں، طعنوں میں بدلنے لگیں۔ گاؤں کے دوسرے سرے پر رہنے والی خاتون بھی جمالے پر پورا حق جتاتی۔

’’نونہہ رانیئے، کچھ ہل جل۔ ہمارا، جمالا کلّا کلّا ہے۔ کچھ ’وادھا‘ ہو گا تو بات بنے گی۔‘‘

صاحباں سنتی اور دِل مسوس کر رہ جاتی۔ اس کے بس میں کیا تھا؟

سارا گاؤں اور رِشتہ دار بہت فکرمند تھے۔ ظاہر ہے فکرمند تو امّاں بھی تھی۔ لیکن اس جیبن جوگی نے دُعائیں تو بہت دی تھیں کبھی طعنہ نہیں دیا تھا۔ اور جمالا بھی ربّ پر یقین رکھے ہوئے تھا۔ پھر صاحباں کا علاج شروع نہیں ’ہوا‘، علاج شروع ’ہوئے‘۔ ہر کسی کا بتایا ہوا نسخہ، ٹوٹکہ، تعویز، گنڈا اور پڑھا ہوا پانی، کشتے اور تنکے پر ڈال کر مکھن کے ساتھ کھائی جانے والی دوائی اور بہت کچھ۔

لیکن صاحباں کو ٹس سے مس نہیں ہونا تھا، نہیں ہوئی۔ البتہ دوائیاں کھانے اور استعمال کرنے اور امّاں کی ٹھنڈی سانسوں اور رشتہ دار خواتین کے طعنے اور باتیں سن سن کر صاحباں کا لشکارے مارتا رنگ رُوپ، مٹیالے بے رونق چہرے میں بدل گیا۔ چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی کٹوراسی آنکھیں اندر دھنس گئیں اور گالوں کی ہڈیاں یوں اُبھر آئیں کہ اسے حسرت کی تصویر بنا دیکھ کر بھی ان عورتوں کو رحم نہ آتا اور وہ آتے جاتے اسے کچو کے لگانے سے باز نہ آتیں۔

ایک روز صبح جمالا کسی کام سے شہر جا رہا تھا کہ راستے میں گاؤں کے واحد حکیم صاحب مل گئے۔

''کیوں بھئی۔۔۔سب کچھ کر کے دیکھ لیا نا! اب ذرا میری دُکان تک آ، مجھے تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''حکیم جی شام کو آؤں گا۔ ذرا شہر تک جا رہا ہوں۔ ضروری کام ہے۔''

''اس سے زیادہ ضروری کونسا کام ہوسکتا ہے؟ چل سیدھا ہو کے اگے لگ۔ میری بات سن لے پھر جو مرضی کرنا۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں میں بیاہ کر آنے والی بہو، گاؤں کی بہو اور گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی تھی اور کسی بھی بڑے کا کہا کوئی بھی چھوٹا ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جمالا، حکیم صاحب کے ساتھ ان کی دُکان پر چلا گیا۔

حکیم صاحب نے کوئی آدھ گھنٹہ اسے آہستہ آہستہ سمجھایا اور چاند کی تاریخوں کا کچھ حساب بتایا اور جمالا انھی پیروں واپس آیا اور صاحباں کو اپنے کمرے میں بلا کر کچھ پوچھ گچھ کی اور پھر اسے تیار ہونے کا کہا۔

''دو تین جوڑے بھی رکھ لینا۔۔۔ اچھے اچھے، ہمیں ایک ہفتہ وہاں ٹھہرنا ہے۔''

''ایک ہفتہ؟؟ نہیں ہم دوائی لے کر آجائیں گے۔ امّاں گھر میں اکیلی رہے گی۔''

''تجھے جو کہا ہے وہ کر۔۔۔'' جمالا بہت خوش تھا۔

''میں ابھی تاجی دھوبن کو بلا کر لاتا ہوں وہ اتنے دِن امّاں کے پاس رہے گی۔''

چلتے چلتے جمالے نے جب امّاں کو بتایا کہ وہ ایک ہفتہ وہاں رہیں گے تو وہ بھی پریشان سی ہوگئی۔

''ست دِن؟ نہ۔۔۔نہ۔۔۔دوائی لے کر گھر آجانا۔''

''نہیں امّاں حکیم صاب دوائی کا اثر دیکھ کر ساتھ ساتھ اسے بدلیں گے، صاحباں

کی طبیعت کے حساب سے۔ جب دوائی اسے راس آجائے گی تو ہم واپس آجائیں گے۔ تین بار جانا ہوگا۔ ربّ کرے پہلے پھیرے ہی کام بن جائے۔ فکر کی کوئی بات نہیں بس تو دُعا کرنا اچھا۔۔۔ربّ دے حوالے۔''

''تم دونوں بھی ربّ دے حوالے۔''

امّاں نے دونوں کو پیار دیا اور دروازے پر کھڑی اس وقت تک سورتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی جب تک وہ مڑ کر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگئے۔ رنگ پور کے حکیم صاحب کو اکھاڑے کے حکیم صاحب کا حوالہ دیا تو انھوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا اور کہا۔

''حکیم کرم دِین بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ کبھی، کبھار بیماروں کو میرے پاس بھیجتا رہتا ہے۔''

''پھر حکیم صاحب نے اپنا خرچہ پانی اور فیس بتائی جو کافی بھاری رقم تھی تو جمالے نے جھٹ سے پیسے انھیں دے دیئے جو وہ حکیم کرم دِین کے کہنے پر لے کر آیا تھا۔ پیسا، جمالے کے لیے مسئلہ نہ تھا اور پھر اولاد کے لیے تو وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

حکیم صاحب نے ایک کمرہ ان کو دکھایا جس میں ان کی رہائش ہونا تھی۔ ساتھ میں حکیم صاحب کا کمرہ تھا جو کسی نئی دُلہن کے لیے سجائے گئے کمرے جیسا تھا۔ دونوں اسے دیکھ کر حیران رہ گئے حکیم صاحب کے ڈیرے کے نزدیک کوئی رہائش نہیں تھی، اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ حکیم صاحب نے جنگل میں منگل بنا رکھا تھا۔

پھر حکیم صاحب نے جمالے کو بلا کر، الگ بیٹھا کر ''حقیقت'' پوچھی، چاند کا حساب نکالا اور کہا کہ کھانا کھا کر تم لوگ آرام کرو، آج تھکے ہوئے ہو، سفر بھی تو کافی ہے۔ صبح سے دوائی شروع کریں گے۔

حکیم صاحب کا نوکر ان کے کمرے میں کھانا لے آیا۔ بھنی ہوئی مرغی اور سوجی کا حلوہ اور دودھ کے دو گلاس۔

صاحباں کو محسوس ہوا کہ وہ تو حکیم صاحب کے خاص مہمان ہیں لیکن جب نالے نے بتایا کہ حکیم صاحب نے چنگی چوکھی رقم کھانے کے نام کی لی ہے تو وہ مطمئن ہوگئی۔

اگلا دن دونوں باہر درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

جمالے نے کہا:

"صاحباں اگر کاکا ہوا تو اس کا نام سلطان علی رکھیں گے اور اگر کاکی ہوئی۔۔۔"

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ صاحباں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس کاکا ہی رہنے دے نہیں تو زنانیاں میری جان کھا جائیں گی کہ اتنی دیر بعد ہوئی اور وہ بھی کُڑی۔۔۔"

"گولی مار تو زنانیوں کو۔ ان کو تو کسی پیر کی بددُعا لگی ہوئی ہے۔ بھونکتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی میں نے اور اماں نے ایسی بات کی ہے۔ اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔۔۔ بس دُعا کر ہم یہاں سے فیض حاصل کر کے ہی جائیں۔"

اس رات کا کھانا کھانے کے بعد حکیم صاحب نے کہا کہ پہلے دُعا کرتے ہیں پھر دوائی دوں گا۔ ربّ اپنی رحمت کرے۔

جب حکیم صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو صاحباں نے دیکھا کہ ان کے دائیں ہاتھ کی چھ اُنگلیاں تھیں۔ صاحباں کو انگوٹھے کے ساتھ لٹکتی چھوٹی اُنگلی دیکھ کر گھن سی آئی لیکن اس نے پھر بڑی توبہ تیف کی۔

اس نے سوچا۔

"یہ تو ربّ سوہنے کے کام ہیں۔ کونسی اپنے بس کی بات ہے۔ یوں تو حکیم صاب بڑے سوہنے ہیں۔ یہ طباق سا چہرہ اور گالوں پر لالیاں۔ اُونچا لمبا قد، گھبرو جوان عمر بھی چالیس سال سے کم ہوگی۔ اور اگر میرے بچے کی بھی چھ اُنگلیاں ہوں۔ تو میں کیا کرلوں گی۔ ربّ مجھے ماف کرے۔"

پھر حکیم صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور پہلے ایک بدبودار سرخ رنگ کا شربت، چھوٹے سے چاندی کے کٹورے میں دیا۔ صاحباں کو اُبکائی آ رہی تھی۔ لیکن حکیم صاحب نے اسے بتایا کہ یہ طاقت کی دوائی ہے۔ اس کو پی کر منہ بُرا بنانے کی ضرورت نہیں۔ پھر انھوں نے وہی کٹورا دوبار خوب بھر کر پیا اور ہنسے۔

"مَیں بھی تیرے ساتھ صحت بنا لیتا ہوں۔"

شربت جیسے آگ سے بنا تھا۔ اس نے حلق سے اُترتے ہی صاحباں کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے لگا جیسے بچپن میں میلے میں ہنڈولوں والے جھولے پر بیٹھی ہے۔ اردگرد اس کی سہیلیاں بیٹھی ہیں اور جھولے کے تیز ہونے کے ساتھ ساتھ ہنس رہی ہیں اور چیخیں مار رہی ہیں۔

'بھائی بھائی بھائی
تیری تیل دی کڑاہی
تیرا لون دا پتاشہ
تیری رَن کرے تماشہ
بھائی زور دی۔۔۔۔
زور دی۔۔۔۔۔۔
زور دی۔۔۔۔۔۔'

پھر اسے لگا وہ گرنے لگی ہے اور جمالے نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا ہے۔ اس کے سینے کے ساتھ لگنے سے جیسے دوائی کی جلن غائب ہوگئی اور ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

پھر وہ گہری نیند سوگئی اور رات بھر آسمانوں کی سیر کرتی رہی۔۔۔ کبھی اُوپر۔۔۔ کبھی نیچے۔۔۔ کن کن وادیوں میں کن کن گھاٹیوں میں۔۔۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں جمالے کے برابر والے بستر پر سو رہی تھی۔ اس کے منہ کا مزہ بہت بُرا تھا۔

لیکن اس کے بدن سے وہی خوشبو اُٹھ رہی تھی جو حکیم صاحب نے لگائی ہوئی تھی۔ اس نے حکیم صاحب کو بتایا کہ اس کا سر بھاری ہے اور اُبکائی آ رہی ہے۔

حکیم صاحب کہنے لگے:

''میری صاحباں تو بڑی پیاری ہے اور بڑی ہی بھولی۔ میرا خیال ہے میں دس دِن تجھے دوائی دوں گا تا کہ تو جھولی بھر کر فیض حاصل کرے۔ اب ناشتے میں خوب سا اچار کھانا پراٹھے کے ساتھ اور کڑک دودھ پتی پیو اور باغیچے میں بیٹھو دونوں جا کر۔ میں تو ساری رات عبادت کرتا رہا ہوں اس سوہنے ربّ کی جس نے تجھے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہ اسی چلّے کا اثر ہے۔ تجھے اپنے بدن میں سے میری خوشبو نہیں آ رہی؟''

صاحباں نے خوش دِلی سے کہا۔

''کہتے تو کرماں والیو آپ سچ ہی ہو میں تو مہک رہی ہوں۔''

اسی طرح مزے سے کھاتے پیتے اور رات کو نیند میں جھولے جھولتے دس دِن گزر گئے۔

وہ واپس آئے تو بہت خوش تھے اور پُر اُمید بھی۔ اُس نے صاحباں کے دِل کو مطمئن کر دیا تھا اس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی اور جب اگلے ہی مہینے اسے اُبکائیاں آنے لگیں تو گاؤں کی عورتوں نے اماں کو مبارکیں دیں۔

پورے سوا نو مہینے کے بعد صاحباں کے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ چوڑا طباق سا چہرہ، صاف رنگ اور کھلے ہڈوں پیروں کا۔۔۔ لگتا تھا بڑا ہو کر سوہنا گھبرو جوان بنے گا۔ اس کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹی سی اُنگلی تھی عورتیں دیکھتیں تو کہتیں:

''اماں کا کا سوہنا بھی بہت ہے اور نصیبوں والا بھی، چھانگا ہے۔''

ایک روز اماں نے جمالے سے کہا کہ جب صاحباں چِلا نہا لے گی تو وہ خود حکیم صاب کو بکرا اور پیسے دینے جائے گی۔

''کاکا حکیم صاب کا نام کیا ہے؟''

''حکیم کا نام تو مجھے آتا نہیں بس حکیم چھانگا کہتے ہیں اسے۔''

''کیا؟؟؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے بے غیرتا یہ تو نے کیا کیا؟''

''اماں ایسے نہ کر۔ دیکھ ربّ نے کتنی سوہنی اولاد دی ہے۔''

''اولاد؟ ڈُب جا پرے شرم سے۔''

اماں بہت غصے میں تھی۔

''دیکھ اماں ایتھے ای چپ کر جا۔ اولاد ہی تو ہے۔ جمیا تو اسے میری صاحباں نے ہی ہے نا۔''

''اور تخم؟''

''دوہرے مزے ہو گئے ہیں اماں دوہرے مزے۔ ربّ نے اولاد بھی دے دی اور میں 'بزت' ہونے سے بھی بچ گیا۔''

□□□

اپناپن

ایمن جیسے ہی ٹسٹ اور انٹرویو سے فارغ ہوئی اس نے پروگرام بنایا کہ Fountain House جا کر اپنی دوست ڈاکٹر اصفیٰ سے ملے گی۔ لیکن گورنمنٹ کے منصوبوں کی طرح اس کا پروگرام بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ شام کو روزانہ وہ ٹیلی فون پر لمبی چوڑی گفتگو کرلیا کرتی تھیں۔

آخر وہ اس میں کامیاب ہو ہی گئی۔ اس نے راستے میں ایک بڑی بیکری پر گاڑی روکی اور اصفیٰ کی پسند کا چاکلیٹ کیک اور پیزا لیا جسے اب نوجوان امریکن لہجے میں 'پٹیزا' کہنے لگے ہیں۔ فاؤنٹین ہاؤس میں ٹی بریک تھی۔ اس لیے وہ ایک وارڈ بوائے کے ساتھ سیدھی ٹی رُوم میں چلی آئی۔ اصفیٰ اور اس کے کولیگز نے اسے خوش آمدید کہا اور چائے کے لوازمات کو دیکھ کر ایک نعرۂ 'رندانہ' بلند کیا۔ ٹھنڈے پُرسکون ٹی روم میں بڑے مزے سے چائے پی گئی۔ پھر وہ ڈاکٹر اصفیٰ کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی۔

ایمن اور اصفیٰ سکول میں پڑھنے کے بعد سے ایف۔ ایس۔ سی تک کلاس فیلو رہی تھیں گہری دوستی تھی اور پڑھائی کے معاملہ میں بھی دونوں 'کبھی' ابا میاں آگے کبھی 'توپ' کا گولہ آگے' کے مصداق سخت مقابلے کی صورتِ حال میں رہتیں لیکن فائنل امتحان سے چند

روز پہلے ایمن کو تیز بخار نے آلیا۔ ٹسٹ سے معلوم ہوا کہ ٹائیفائیڈ ہے۔ اس لیے وہ یکسوئی سے امتحانات نہ دے سکنے کے باعث چند نمبروں سے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ لے پائی اب تعلیمی بورڈ کا یہ اصول کہ ڈویژن کو بہتر بنانے کے لیے امتحان دوبارہ دیا جاسکتا ہے لیکن نمبر بہتر بنانے کے لیے نہیں، اسے لے بیٹھا۔ اِس نے بہتیرا سوگ منایا کہ اس کے علاوہ کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال اپنی سائیکاٹرسٹ بننے کی خواہش کو اس نے سائیکالوجسٹ کے رُوپ میں پورا کیا۔ اب وہ پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے نتیجہ کے انتظار میں فارغ بیٹھنے کی بجائے اپنی دوست ڈاکٹر اصفیٰ کے پاس آنریری طور پر کام کرنا چاہتی تھی۔ یوں انتظار کا عرصہ با آسانی گزر جاتا اور تجربہ بھی حاصل ہوجاتا۔

اس کے بچپن میں فاؤنٹین ہاؤس کا تصور، پاکستان میں موجود نہیں تھا۔ ذہنی مریضوں کے لیے جو ادارہ موجود تھا اس کا نام Mental Hospital تو پھر قابلِ قبول تھا لیکن لفظ پاگل خانہ کی درشتگی کسی بھی حساس انسان کو ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ کسی بھی لحاظ سے معذور انسان کو فلموں یا ڈراموں میں بے بس انسان دکھا کر تفریح کا سامان پیدا کیا جاتا۔ بچے تو بچے بڑوں کو بھی ان سے اس طرح کے مذاق کرتے دکھایا جاتا کہ کسی بھی زود حس کی برداشت جواب دے جاتی۔

دوستوں کی محفل میں اگر کوئی غلط بات کہہ دیتا تو سب ہنستے اور کہتے:

''اسے چار نمبر بس پر بٹھا دو۔''

لاہور میں 4 نمبر اومنی بس اس رُوٹ پر چلتی تھی جس پر 'پاگل خانہ' پڑتا تھا۔ بے تکلف دوست ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے تو اسے 'پاگل خانہ' کہہ کر مخاطب کرتے۔

پاکستان میں یا تو کوئی شخص نارمل ہے (یہ الگ بات کہ اکثر لوگ خود کو 'نارمل' ہی سمجھتے ہیں۔) یا پاگل۔ اس کے درمیان کوئی حالت نہیں ہے۔ لیکن زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتے کرتے کسی بھی شخص کو نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہوتے دیر نہیں لگتی لیکن عام طور پر

لوگ کسی نفسیاتی ماہر کے پاس جانا پسند نہیں کرتے یا تو خود اس کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے یا پھر خود کو 'پاگل' کہلوائے جانے سے ڈرتے ہیں یا ان کے گھرانے کے لوگ اسے باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جسم کی طرح ذہن کا بیمار ہونا بھی اچنبھے کی بات نہیں ہے بلکہ بہت سی جسمانی بیماریوں کی وجہ بھی نفسیاتی ہوتی ہے۔

ٹی بریک ختم ہونے پر دونوں ڈاکٹر اصفی کے آفس میں آ گئیں پھر اصفی نے اپنی ٹیبل ڈائری دیکھ کر اُسے بتایا کہ تھوڑی دیر میں ایک NGO سے کچھ لوگ فاؤنٹین ہاؤس کو وِزٹ کرنے آ رہے ہیں، تم بھی اُن کے ساتھ ہی سارا ہسپتال دیکھ لینا۔

NGO سے آنے والی الٹرا ماڈرن خواتین اور سفید بالوں کی پونی ٹیل بنائے ہوئے مردوں کو ریسیپشن لابی میں بٹھانے کے بعد اُن کی تواضع کولڈ ڈرنک سے کی گئی اور پھر انھیں آڈیٹوریم میں لے جا کر فاؤنٹین ہاؤس کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دِکھائی گئی۔ تاریک کمرے میں پردے پر تصویریں اُبھریں اور مبصر کی آواز سنا دی۔

'فاؤنٹین ہاؤس لاہور، ذہنی معذور افراد کی بحالی کا فلاحی ادارہ ہے۔ جس کی بنیاد لاہور مینٹل ایسوسی ایشن کے اشتراک سے ڈاکٹر چوہدری رشید نے 1962ء میں رکھی تھی۔ جب کہ اس ادارے نے باقاعدہ کام کا آغاز 1976ء میں کیا۔

فاؤنٹین ہاؤس ایشیا کا واحد ادارہ ہے جس میں ذہنی مریضوں کے علاج پر کام ہو رہا ہے۔ اس قت ہمارے پاس 450 کے قریب افراد ہیں جن کو ہم ممبرز کہتے ہیں۔ ان میں تین سو کے قریب یہاں پر اور 100 کے قریب ممبرز فاؤنٹین ہاؤس فاروق آباد شیخوپورہ میں ہیں۔ فاؤنٹین ہاؤس پر خرچ کیا جانے والا ایک بھی پیسہ کسی غیر ملکی ایجنسی سے حاصل نہیں کیا گیا۔ تمام رقم مخیّر پاکستانی حضرات کی فراہم کردہ ہے۔ ہم نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جسے adoption پروگرام کا نام دیا گیا ہے یہ ان ممبرز کے لیے ہے جو والدین کی غیر موجودگی میں دیگر رشتہ داروں کی توجہ حاصل نہیں کر پاتے اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس

کے ساتھ شرط یہ ہے کہ مالی امداد کے ساتھ ساتھ وہ مہینے میں ایک بار ان سے ملاقات کے لیے ضرور آئیں۔

ممبرز، شدید ذہنی انتشار کا شکار ہونے کی وجہ سے معاشرے کے عام افراد کے لیے غصہ اور نفرت کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔

اس ادارے کا نام، اسی نام سے موسوم نیویارک میں موجود ادارے کے حوالے سے رکھا گیا ہے۔ یہاں نفسیاتی امراض کے علاج اور بچاؤ کی تدابیر پر کام کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام میں اس کی آگاہی پیدا کی جاتی ہے تا کہ ان افراد میں موجود موروثی وجوہات کے علاوہ معاشرتی عنصر کو کم کیا جا سکے۔

ممبرز کا علاج جدید مشینوں، ادویات اور جسمانی اور ذہنی ورزش کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ مذہب کی طرف راغب کرنے کے لیے پنج وقتہ نماز پر زور دیا جاتا ہے اور روزگار کے سلسلہ میں کسی ہنر کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

فاؤنٹین ہاؤس 50 سے 80 فی صد زکوٰۃ، صدقات اور عطیات کے ذریعے اخراجات پورے کرتا ہے۔'

ڈاکومنٹری کے دوران سفید بالوں کی پونی ٹیل بنانے والے مرد حضرات توجہ سے اسے سنتے رہے لیکن فیشن اور NGO زدہ خواتین کی مسلسل کھسر پھسر سنائی دیتی رہی۔

'آخر میں مبصر نے کہا کہ یہ لوگ آپ سے کچھ نہیں مانگتے۔۔۔ سوائے آپ کی توجہ اور محبت کے۔ اور پھر بڑے جذباتی انداز میں اپیل کی کہ انھیں ایک پیار بھری مسکراہٹ، روشن اُمید اور ایسے ساتھ کی ضرورت ہے جو انھیں سمجھا سکے کہ ہم ان میں سے ہیں اور یہ ہم میں سے۔'

آنے والے مرد حضرات نے تو اس لیکچر کو بغور سنا۔ لیکن خواتین سارا وقت آپس میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ اُن کے انداز سے لگتا تھا کہ ڈاکٹرز کے حلیوں اور لباس کو

زیرِ بحث لائے ہوئے تھیں۔

پھر ان لوگوں کو سنٹر کا معائنہ کروایا گیا اور یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی کہ سنٹر میں داخل افراد کو مریض ہرگز نہ کہا جائے بلکہ 'ممبر' کہہ کر بلایا جائے۔

NGO کی فیشن زدہ خواتین نے بہت خوبصورتی سے پیک کیے ہوئے تحفے 'ممبران' میں تقسیم کیے۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے فوٹو گرافر نے کھٹا کھٹ اور دھڑا دھڑ ان کی تصاویر بنائیں۔ اس کے بعد ٹی روم میں انھیں چائے پلائی گئی اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ رُخصت ہو گئے۔

ایمن نے بھی NGO سے متعلقہ افراد کے ساتھ ہی وزٹ مکمل کیا اور واپس، ڈاکٹر اصفیٰ کے آفس میں آ گئی۔ ابھی بمشکل آ کر بیٹھی ہی تھی کہ ایک وارڈ میڈ بھاگتی ہوئی آئی۔

''یا خدا۔۔۔خیر۔۔۔'' اصفیٰ بڑبڑائی۔

''کوئی ایمرجنسی؟'' ایمن نے پوچھا۔

''نا بھی ہو تو 'مودی' کا آنا ہی ایک ایسا عمل ہوتا ہے کہ عام حالات بھی ایمرجنسی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔''

مودی کے ہاتھ میں کھلا ہوا گفٹ پیک تھا۔

''ڈاکٹر صاب جی وہ چٹی پونیوں والے صاب اور وہ آنٹیاں جنھوں نے اللہ جھوٹ نہ بلائے۔۔۔ ہر ہاتھ میں کم از کم 10، 10 انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔۔۔ میں نے خود گنی تھیں جی۔ یہ تحفے دے کر گئے ہیں 'ہمارے ممبروں' کو۔''

اس نے پیکٹ میز پر رکھا جس میں ٹافیوں کا چھوٹا سا لفافہ تھا اور ایک جرابوں کا جوڑا جسے مودی نے چٹکی میں پکڑ کر یوں اُٹھایا جسے وہ مری ہوئی چوہیا ہو۔

''یہ؟؟؟''

''ہاں جی یہ! جتنے پیسے ان کو سجانے بنانے میں لگائے اور جتنے کی تصویریں کھنچوائیں، اسی پیسوں سے ان کے لیے کوئی کام کی چیز لے آتیں۔'' مودی نے مفت لیکن اچھا مشورہ دیا۔

''مودی تم اسے یہاں کیوں لے آئیں؟''

''یہ تو جی ماں جینے نے مجھے دیا ہے کہ میں ٹافی نہیں کھاؤں گی۔ کہتی ہے مجھے 'شوکر' ہو جائے گی اور جراب بھی نہیں پہنتی کہتی ہے، گرمیوں پہنوں گی اتنی دیر تم پہن لو۔ باقی سارے ممبر تو جرابیں پہن کر بیٹھے ٹافیاں 'چَب' رہے ہیں۔ صرف دس بارہ تو ٹافیاں ہیں۔ 'چھیتی ویہلے' ہو جائیں گے۔''

''مودی تم نے آج تک یہ پتا نہیں چلنے دیا کہ تمھیں چپ کروانے والا سوئچ کہاں لگا ہوا ہے؟'' ڈاکٹر اصفیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوہو میں بھول ہی گئی۔ اپنی 'ندیا' کو 'سانبھیں' جا کر۔ وہ تو بہت لہر میں ہے آج۔ پہلے تو پہنچے 'ٹنگ' کر کمرے میں پیر ایسے اُٹھا اُٹھا کر چلتی رہی جیسے پانی میں سے گزر رہی ہو۔ پھر جا ماں جینے کو 'چھا' مارا۔ پھر اسے 'ٹوہ' ٹاہ کر دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کسی کے قابو میں نہیں آ رہی آج تو جی 'توا' پٹھا بج رہا ہے۔ پنجابی کا گون گا رہی ہے۔ 'گھڑیا گھڑیا۔۔۔ ہاں ہاں اڑیا۔'' مودی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹھمکا لگایا۔

''اور تم مودی یہ بتانے کی بجائے مجھے یہ رام کہانیاں سنا رہی ہو؟ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ چپ کرو۔۔۔ تم خود کونسا کم ہو۔ ایمن ذرا تم جاؤ مودی کے ساتھ۔ مودی یہ ہماری نئی سائیکولوجسٹ آئی ہیں۔ یہ ندیا ہماری نئی ممبر ہے اسے سنبھالو جا کر۔''

ڈاکٹر اصفیٰ نے غصے سے کہا اور پھر ایمن کو اس کے ساتھ، بھیجا کہ صورتِ حال کو ہینڈل کرے۔ ''سمجھو آج سے تم ڈیوٹی پر ہو۔''

''آئیں جی۔'' مودی نے کھٹ سے پاؤں جوڑ کر ایمن کو سیلوٹ جھاڑا۔ ایمن

نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔

''کیا کروں جی۔۔۔ان ممبروں میں رہ کر خود بھی ممبر بن گئی ہوں۔''

پھر مودی نے بڑے رازدارانہ انداز میں ایمن کے پاس جا کر سرگوشی کی۔

''جی یہاں پاگلوں کو ممبر کہتے ہیں اور اگر کوئی پاگلوں کو پاگل کہہ دے تو توبہ وڈے، ڈاکٹر صاب بڑی 'بزتی' کرتے ہیں۔''

وہ لوگ وارڈ کی طرف مڑی ہی تھیں کہ کاریڈور میں گانے کی خوبصورت آواز سنائی دی۔

'پار چناں دِسے گلی یار دی
رات ہنیری سر تے جھلی پیار دی
گھڑیا گھڑیا ہاں ہاں اڑیا'

''یہ ندیا گا رہی ہے۔ اب وہ کنٹرول ہو گئی ہے۔ ذرا تھوڑی دیر رُک جائیں۔ گانا سن لیں۔ بڑا اچھا گاتی ہے۔ پہلے تو اُردو گانا گاتی تھی 'موہے جانا ہے ساجن کے دوار۔۔۔ ندیا دھیرے بہو۔۔۔' لب کسی دن انگریزی گانے نہ گانے لگے۔۔۔ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آئے گی۔''

(اصفی واقعی ٹھیک کہتی ہے مودی کا mute کرنے والا بٹن پتا نہیں کہاں ہے؟'' ایمن نے سوچا۔)

''دیکھو لفاں پینیدیاں نہ چھڈیں دِل وے۔۔۔نہ چھڈیں دِل وے
اج مہینوال نوں میں لینا مل وے
آ کھے دِل وے
کچی میری مٹی کچی میرا نام نی
میں ناکام نی

کچیاں دے ہندے کچے انجام نی۔۔۔یہ گل عام نی
کچیاں توں رکھئے نا اُمید پار دی۔۔۔ہاں ہاں اڑیئے ہاں ہاں اڑیئے۔

گانا ختم ہوا۔ یہ لوگ وارڈ میں داخل ہوئیں۔ تو ایک تیس بتیس سالہ خوبصورت عورت فرش پر بیٹھی۔ بُری طرح سر پیٹ رہی۔ پہلے ہی بیڈ سے بھی ایک 35 سالہ عورت ان کی طرف بھاگی آئی۔

''ڈاکٹر صاب جی۔'' اس نے مودی کو دھکا دیا۔ ''توں تے پرے ہونا!'' پھر ایمن سے مخاطب ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحب جی، آج میں نے نیا وظیفہ شروع کیا ہے۔ میرا خاوند دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا ہے۔ میری اور میرے بچوں کی پروا نہیں کرتا پیر بادشاہ نے نیا وظیفہ بتایا ہے لیکن یہ منحوس ماری کرنے دے تو کروں نا۔''

''ڈاکٹر صاب جی یہ ممبر ہے اسے نہیں پتا کہ 'خوند' وظیفوں سے نہیں مڑتے۔ نہیں تو میں آج یہاں ہی کھجل ہو رہی ہوتی۔'' مودی نے کہا۔

اس عورت نے سر پر سفید دوپٹہ خوب کس کر لپیٹ رکھا تھا اور ندیا کو قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔'' ایمن نے اس خاتون کی ڈھارس بندھائی۔

''یہ سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔'' اس کی آنکھیں ابھی بھی آگ برسا رہی تھیں۔

''پھر؟ چلیں آپ تو میری بات کو سمجھیں نا۔ آپ دوسری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جائیں اور وظیفہ کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔''

''اچھا جی۔'' عورت نے تابع فرمانی کا مظاہرہ کیا اور یوں مطمئن ہو گئی جیسے یہ 'انوکھی ترکیب' ایمن ہی بتا سکتی تھی۔ اس نے ایمن کا ہاتھ چوم کر آنکھوں کو لگایا اور آرام

سے بستر پر بیٹھ کر وظیفہ کرنے لگی۔

یہ کمرہ چار خواتین کے لیے تھا۔ تیسری عورت مگن بیٹھی گانے پر سر دھن رہی تھی۔ چوتھی سو رہی تھی۔

گانے والی نے اچانک دلدوز چیخ ماری اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سن کر سوئی ہوئی عورت نے ''چور، چور'' کا شور مچایا اور کمرے کے دروازے بند کرنے لگی۔ مودی نے بمشکل اسے اس بات پر منایا کہ پولیس چوروں کو پکڑ کر لے گئی۔ اس لیے وہ آرام سے سو جائے۔۔۔ وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی اور ایک منٹ میں خراٹے لینے لگی۔

وظیفہ کرنے والی عورت نے اسے بھی گھورا لیکن اس کے جلد سو جانے پر سکون سے وظیفہ کرنے لگی۔

ندیا کے کندھے پر ایمن نے ہاتھ رکھا تو وہ اس سے لپٹ کر بسورنے لگی۔

''ڈاکٹر جی میں نے اماں کو پہلے ہی 'اس' کے بارے میں بتا دیا تھا کہ یہ تو میری اپنی ہے نا۔ لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور دو دِن کے اندر رِشتہ ڈھونڈ کر میری شادی کر دی۔

ایمن نے ندیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے آرام سے کہا:

''میری بات سنیے۔''

اس کے ہاتھ یوں رُک گئے جیسے مشین کا سوئچ آف کر دیا گیا ہو۔ ماتم بند کرنے کے بعد اس نے خالی نظروں سے ایمن کی طرف دیکھا اور کہا کہ اس کے بازو شل ہو گئے ہیں اور ایمن یہ سوچ رہی تھی اس کے سر کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟

''آپ کیوں رو رہی ہیں؟ آپ کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ مجھے بتائیں، شاید میں آپ کے لیے کچھ کر سکوں۔''

وہ خاتون اُٹھی اور اُٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی اور اسے بھی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا اور

سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کیوں رو رہی ہیں؟''

''ان سب کم بختوں کو 'پچاس' بار بتا چکی ہوں۔ لیکن انھیں آج تک سمجھ نہیں آیا۔ اب تم پوچھنے آ گئی ہو۔۔۔ لو تم بھی سن لو۔ دیکھتی ہوں تم کیا کرتی ہو۔'' اس بار اس خاتون نے اتنی سمجھداری سے بات کی کہ ایمن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو کچھ دیر پہلے اس بُری طرح رو رہی تھی۔

اچانک وہ اُٹھی اور بے ڈھنگے پن سے ناچنے لگی۔ ساتھ ساتھ ایک پرانا پنجابی گانا بھی گا رہی تھی۔

؎ چپ کر دڑ وٹ جا نہ عشق دا پھول خلاصہ
اوچڑی لتھ جاوٴ گی بن جائیں گی توں جگ دا ہاسا

ایمن نے بمشکل اسے کندھوں سے پکڑ کر بستر پر بٹھایا، پیار کیا، چمکارا تو وہ اس کے گلے سے ایسے چمٹی کہ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ایمن سوچ رہی تھی کہ ایک ہی مسئلہ کا حل ایک عورت وظیفے میں تلاش کر رہی اور دوری ناچ گا کر۔

آخر کار وہ اپنا مسئلہ بتانے کے لیے سیدھی ہو گئی۔

''مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ پیار بھی اتنا کہ بہت زیادہ۔ انھی دِنوں میرا ایک رشتہ آیا۔ میں نے سوچا پہلے ہی ماں کو بتا دیتی ہوں۔۔۔ وہ تو میری اپنی ہے نا! لیکن س نے تو مجھے وہ پیٹا۔۔۔ وہ تھپڑ مارے کہ اب تک دِل میں ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔ اور اگلے دو چار دِن میں اس رِشتے کو قبول کر کے میرا نکاح کر دیا اور رُخصتی بھی۔۔۔ اب کوئی میری ماں سے پوچھے کہ جس کا میں نے بتایا تھا وہ اس سے بھی اچھا تھا پھر وہ قبول کیوں نہ کیا؟ بس مرضی تھی اس کی۔

خیر جب میں رُخصت ہو کر اپنے سسرال گئی تو میں نے رات کو ہی اپنے شوہر کو

سب بتا دیا کہ یہ تو میرا اپنا ہے۔اس نے مجھے اتنا مارا کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔اس نے صبح کو مجھے طلاق دے کر ماں کے گھر بھجوا دیا۔ بندہ پوچھے کہ جب طلاق ہی دینی تھی تو مارا کیوں؟ میرا سرا بھی تک درد کر رہا ہے۔باجی اب میں نے سوچا کہ وہ جس سے میں شادی کرنا چاہتی تھی۔۔۔جو میرا اپنا تھا۔اس سے سب کہہ دوں گی۔"

"باجی صاب جی، وڈے ڈاکٹر صاب سے کہہ کر اس کی sim بدلوا دیں جی۔اس کو 'جونگ' (Zong) والوں نے برباد کیا ہے۔'سب کہہ دو۔۔۔سب کہہ دو' اور یہ پاگل میرا مطبل ہے ممبر۔۔۔چل پڑتی ہے سب کہنے۔۔۔"مودی پتا نہیں کہاں سے آ ٹپکی تھی۔

ندیا نے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایمن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"لو اگلی سنو۔۔۔"اس نے ایمن کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور زور سے ہنسی۔

"جب میں نے اس کو بتانا چاہا کہ اصل میں وہ ہی تو میرا اپنا تھا تو پتا چلا کہ وہ تو شادی کر کے ملک سے باہر چلا گیا۔۔۔ان ہی چند دِنوں میں۔تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اتنی زور سے کہ ابھی تک درد ہو رہا ہے۔"

□□□

ناول 'ادھوری عورت'—چند آراء

ڈاکٹر احسان الحق

ناول 'ادھوری عورت' کا طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور تازہ ہے۔شستہ ہے اور سادہ۔ایک تسلسل ہے جو ہر کردار کو تسبیح کے دانوں کی طرح پرو کر چل رہا ہے۔زبان سلیس اور روزمرہ کی گفتگو جیسی ہے جو جا بجا اُردو اور پنجابی محاورے سے مزین ہے۔جس میں ایک بانکپن اور بے ساختہ پن ہے۔برمحل اور باموقع اشعار کے استعمال نے اسے بے حد خوبصورتی بخشی ہے۔

زیبا کلام بریشم کی طرح نرم ہے۔اس ناول کی کہانی، مصنفہ کے دِل سے نکل کر قاری کے دِل میں اُترتی ہے۔رُک رُک کر گرتی ہے، قطرہ قطرہ بن کر ان کا قلب، ان کی زبان، ان کا سراپا، سب اظہاریہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پروفیسر غلام رسول تنویر

ہمارے کلچر میں گندھے ہوئے ناول 'ادھوری عورت' میں عورت ذات کے دُکھوں کے نوحہ کو بہت مہارت سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔مصنفہ، عورت ہونے کے ناتے عورت کے دُکھ کو بہت گہرائی سے دیکھتی ہیں کیونکہ

ع گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے

عورت جن المیوں کا صدیوں سے شکار ہے۔ اس کے نوحہ میں لوک گیتوں، لوک محاوروں اور جدید طرز کی آزاد نظموں کو یوں بنت میں ڈالا گیا ہے کہ عورت کے وجود کے انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی یہ کوک، ایک ایسے دیپک راگ، ایک ایسی برہا اگنی کی غنائی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے جیسے یورپ کے قدیم کلاسیکل نغمہ نگار، سرسنگھار کے ماہر، سمفنی میں ڈھالنے کا عمل سرانجام دیا کرتے تھے کہ اس میں گہرے انسانی جذبات کی کہانی اُبھرتی محسوس ہوتی ہے۔

یہ ناول ایک اپنی طرز کی شعری نثر کا خوبصورت مرقع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف کرداروں کے خوبصورت، چست اور شوخ مکالموں سے کہانی کو مطالعاتی طور پر دلچسپ بنایا گیا ہے جو قاری کو گرفت میں لانے کے لیے کارگر ہے اور مرکزی اعصاب شکن المیہ میں انتہائی ضروری آسودگی کا سامان پیدا کر کے ناول کے المیاتی منظر کو ناقابلِ برداشت ہونے سے بچاتا ہے۔

محمد افسر ساجد

اُردو میں ناول نگاری کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ 'امراؤ جان ادا' سے 'ادھوری عورت' تک ناولوں کی تخلیق کا ایک تسلسل اس صنف کی اہمیت اور قبولیت کا ثبوت ہے۔

دورِ حاضر یعنی لمحہ موجود میں ناول کا کینوس بہت وسیع ہو گیا ہے۔ 'میں گل کو دیکھ کر تخلیقِ گُل کی سوچتا ہوں' کے مصداق اب ناول میں محض کہانی نہیں ہوتی، کہانی کی توجیحات بھی ہوتی ہیں۔ وحدتِ زمانی، مکانی و عملی سے تجاوز کر کے ناول اب ایک ایسے جہانِ فکر و خیال میں داخل ہو گیا ہے۔ جہاں زندگی اپنی تمام تر لطافتوں اور کثافتوں میں فروکش ہے۔

اس ناول میں عورت کا ادھورا پن ایک کیفیت ہے جو اس عالم ہست و بود میں انسان کا مقدر ہے۔ ناول زندگی کا اشتباہ ہی تو ہے۔ عمرانی سطح پر زندگی حالات کا جبر ہے۔

نفسیاتی سطح پر زندگی عمل اور ردِ عمل کا تصادم ہے۔ فلسفے کی سطح پر زندگی ایک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا۔ جب کہ اخلاقی سطح پر زندگی کتھارسس ہے اور رُوحانی سطح پر زندگی، قدرت کی صناعی کا ایک دلآویز شاہکار ہے۔ جس کا خمیر خیر و شر کی آویزش اور انجام فنا ہے۔

اس ناول کی کہانی ایک مدار ہے۔ جس پر 'ادھوری عورت' کی چھوٹی سی دُنیا مرکوز و محیط ہے۔ ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسانی رشتوں اور رابطوں کے طول و عرض کو اس چھوٹی سی دُنیا میں سمولیا ہے۔ منزہ سلیم کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ پلاٹ پر اس کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ کردار نگاری اس کی تخلیقی بوقلمی کا ثبوت ہے۔

نثار ناسک

'ادھوری عورت' ایک ایسا ناول ہے جو موضوع کے اعتبار سے ایک ایسی خاتون کی زندگی کے گرد گھومتا ہے جو تمام تر خوبیوں کی حامل ہونے کے باوجود، کینسر کی مریضہ بن جانے پر اپنے شوہر کی نظر میں ادھوری ہو جاتی ہے۔

ناول بہت سادہ زبان میں لکھا گیا ہے اور کہانی کے اختتام تک کہیں بھی ابہام یا ماورائے عقل واقعات اور حالات کا احساس نہیں ہوتا۔ کسی جگہ بھی قاری کو اُلجھاوے میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ زندگی کے المیوں کو زبان و بیان کی شائستگی اور شستگی کے دائرے میں رکھا گیا ہے۔

□□□

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

<u>مشتاق احمد یوسفی</u>

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کو ہم ایک اچھی اور سچی آپ بیتی ان معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے جو کچھ دیکھا، بالخصوص بچپن کی آنکھ سے، اسے اپنے دِلنشین پیرائے میں، بغیر کسی رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے پیش کرتی چلی گئیں۔ اسے یادوں اور یادآوری کا خوب صورت، سپیا رنگ کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں ان کی یادوں میں Total recall یعنی جزئیات و کیفیات کی بازآفرینی کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اس زمانے کے مہذب، مڈل کلاس معاشرے کے رسم و رواج، اقدار، ادب آداب اور رہن سہن کے سچے اور دِلکش Thumb nail sketch کا مجموعہ ہے۔ مصنفہ کے لہجے میں حزن و ملال کی زیریں لہر بھی محسوس ہوتی ہے جو قاری کے تبسمِ زیرِ لب کو بہت جلد گلوگیر کیفیت میں بدل دیتی ہے۔

والدین اور بھائیوں کی موت کے غم کی تصویر کھینچتے کھینچتے، اچانک وہ اپنے برش سے ایسا Stroke لگاتی ہیں جو دِل پر پنجے گاڑ دیتا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ format کے اعتبار سے، یہ

ناول یا مختصر افسانوں کی تعریف میں نہیں آتی۔ روایاتی اصطلاح میں اسے سوانح حیات میں نہیں کہا جاسکتا۔ ساری کتاب یدوں پر مشتمل ہے اور ہر یاد اپنا Format اور لب ولہجہ ساتھ لاتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی بنیادی اور سب سے نمایاں خوبی اس کی مطالعیت ہوتی ہے جو صفحہ اوّل سے آخری صفحہ تک پڑھنے والے کی دِل چسپی برقرار رکھ سکے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' اس معیار پر اپنے سادہ اور بے ساختہ اندازِ بیان کے باوجود پوری اُترتی ہے۔

<u>حمید اختر</u>

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کی مصنفہ نے اپنے بچپن کی یادوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی واقعات اس طرح قلم بند کیے ہیں کہ یہ واقعات، متوسط طبقے کے ایک بھرے پُرے خاندان کی روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا عکس بن کر مجسم شکل میں سامنے آتے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

<u>حسن نثار</u>

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' نہ ناول ہے نہ افسانوں یا افسانچوں کا مجموعہ، یہ ایک عجیب و غریب سی Non-book قسم کی کتاب ہے۔ ایک بچی کے بچپن 'لڑکپن' اور جوانی کی گھریلو قسم کی یادوں پر مشتمل جھلکیوں کا مجموعہ ہے جو آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ چھڑک دیتا ہے۔

<u>جمیل صدیقی</u>

جن خواتین و حضرات نے ۵۰ اور ۶۰ کی دہائی میں سانس لیا ہے۔ ان کے لیے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' ان کی اپنی اپنی آپ بیتی بن کر اپنی اثرانگیزی دِکھاتی ہے اور دِلوں کو گداز اور آنکھوں کو نم کردینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

احمد شہباز خاور، ریڈیو پاکستان، فیصل آباد

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' یادوں کے وہ جگنو ہیں جن کی چمک کبھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، کبھی اَشک بن کر اُمڈتی ہے اور کبھی روشنی کی وہ لکیر بن جاتی ہے جو محبت، عزم وعمل، ایثار وقربانی اور زندگی کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔

انجم خلیق، ریڈیو پاکستان، اسلام آباد

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا اندازِ بیان اور واقعات کی عمومیت اتنی متاثر کُن اور بے ساختگی کی آئینہ دار ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے ہر قاری اسے اپنی کتاب سمجھتا ہے۔

پروفیسر صادق حسین

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اس میں پیاروں کے بچھڑنے کا غم، بے رحم موت اور زندگی کی حقیقت کا بے لاگ تبصرہ واضح نظر آتا ہے۔ پلاٹ، کردار اور منظر نگاری، زبان وبیان اور اسلوب کی خوبیاں قاری کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔

رسالہ 'مرہم' سوشل سکیورٹی ڈاکٹرز ایسوی ایشن، فیصل آباد

منزّہ سلیم پھولوں، خوشبوؤں، جگنوؤں اور معصوم شرارتوں کا ذِکر کرتے ہوئے اچانک غم کے بحرِ بے کراں میں غوطہ لگاتی ہیں تو قاری کو ساتھ ہی بہا لے جاتی ہے۔ یہ کہانی ہمارے ہر گھر کی کہانی ہے۔ یہ ہمارے تمہارے اندر، ہماری تمہاری کہانی ہے۔

پروفیسر آفاق صدیقی، رسالہ ہمدرد صحت

یہ کتاب اوّل تا آخر سوانحی ادب کی مثالی کتاب ہے، جس میں کوئی مصنوعی غم انگیزی نہیں اور خوشی کے لمحوں کا انعکاس بھی بڑی موزونیت کے ساتھ خوب صورت عبارت آرائی کی شکل میں نظر آتا ہے۔

REMINISCENCES AND FICTION

Munazza Salim, a noted educationist and writer from Faisalabad, has lately published the second part of her late brother Dr. Maqbool Akhtar's (1938-2010) biography comprising a selection of his writings in Urdu, Punjabi and English. Ahmad Shahbaz Khawar, another bilingual writer of literary repute from the same town, has brought out his second fictional anthology in Punjabi with the symbolic title of Kach da Sach. Both these publications form the subject of this review.

This is the second part of the biographical publication under the above title.

Dr. Maqbool Akhtar was a popular but competent professional psychiatrist, with a conspicuous predisposition to literature, culture and politics of the left. The present book is a collection of his miscellaneous writings in Urdu, Punjabi and English.

As an egalitarian Dr. Maqbool Akhtar's speeches and writings reflect his innate yearning for a change in the status quo making way for the long-cherished ascendancy of the down-trodden, deprived and depressed masses, living in the so-called third world in utterly sub-human conditions. He virtually inherited the tendency from his maternal uncle and mentor comrade (ex-Major) Ishaq Muhammad, a contemporary of Faiz and a staunch revolutionary. Dr. Maqbool's accent therefore carries an ironical undertone directed to circumvent the prevailing social, political, economic and moral malaise endangering the very identity and existence of our nation and country. This is the rationale of his idealizing Faiz, comrade Ishaq Muhammad, Bhagat Singh, Hassan Nasir and Khalid Hassan.

Dr. Maqbool's English writings included in the book are mostly his letters addressed to the media on some vital contemporary social, political and moral issues. His weekly columns appearing on wichaar.com fill up the Punjabi section of this book. Likewise his Urdu writings too bear a journalistic stance meant to highlight the incongruities inherent in the system that we are accredited to as a people living in this part of the world. To say the least, his command of the idiom of the three languages is enviable.

By:

SYED AFSAR SAJID

FAISALABAD LOYAL TO ITS INTELLECTUAL SON

Dr. Maqbool Akhtar was a physician by profession. He was much under the influence of his maternal uncle Maj Ishaq Muhammad of the Rawalpindi conspiracy case fame whose literary debut was the foreword to Faiz Ahmad Faiz's third collection of verse he wrote while in Hyderabad and other jails.

Both Maj Ishaq and Col Faiz were co-prisoners in the case that brought them closer. Perhaps he praised Ishaq's deep understanding of literature, Faiz asked the Major to write the foreword. Ishaq joined left political parties and also wrote literary pieces mainly in Urdu and Punjabi. Maqbool Akhtar got inspiration from the literary and political activities of his late uncle and not only Maqbool but his sister Munazza Saleem, a college teacher, was also under the shadows of her brother and uncle.

Bulleh Shah says that for him the Ka'aba is Takht Hazara; for Munazza, Maqbool Akhtar is her Qibla and Ka'aba.

Maqbool was not only an ideal for Munazza but he was also an exemplary figure for friends, colleagues and intellectuals. Many men of letters praised the literary, political and medical work by the late doctor.

The second part of the first volume consists of tributes paid to Maqbool by doctors, journalists, writers, politicians, civil servants, including Dr Waheed Ahmad, Syed Muhammad Afsar Sajid, Ahmad Shahbaz Khawar, Zaman Khan, Khalid Masud Qureshi and Mahmood Sana.

Dr Maqbool Akhtar was also under the political

OF FICTION AND POSTHUMOUS

This book is dedicated to memory of Dr. Maqbul Akhtar---a well known physician/psychiatrist, an acclaimed bilingual writer and poet, a committed left-wing thinker, a genuine intellectual and above all, a fine human being. His sister Munazza Salim, herself a noted educationist and fiction writer (author of Phool Lakhon Baras Nahi Rahtay and Adhuri Aurat), has authored/compiled it.

Munazza Salim's filial fondness for her brother wells up on the pages of this book as she attempts to conjure up her reminiscences respecting him. The book is visibly divided into two parts viz., memoirs and tributes---personal and public.

The writer has assigned epigrammatic titles in Punjabi to the chapters encompassing her personal reflections (in Urdu) on her deceased brother, as a token o devotion to her mother tongue. Nostalgia, an avid longing for the lost and past (khoey hu'on ki justuju) and an aura of melancholy form the warp and woof of her sentiments in his part. It is beautiful delineation of a sister's attachment to her late brother that she would term an 'unfinished bereavement' in the backdrop of the tragic agony that she had been suffering as sequel to successive deaths of some very close relations in the family.

The memoirs, immersed in nostalgia and designed on a quasi-impressionistic pattern, project the late doctor as a true humanist replete with the milk of human kindness. He had a wide circle of friends, well wishers and admirers. As a psychiatrist be treated his patients with great care and consideration. He excelled in composing quality prose and poetry and was also gifted with a deep critical insight. As an ideologue he was firmly committed to the cause of the

influence of Maj Ishaq and his party Mazdoor-Kissan Party which supported the Kissan Movement of Hasht Nagar (Charsada) which was not liked by feudal Khans, including the Ghaffar Khan dynasty and from there they parted their way.

The second volume includes Urdu, English and Punjabi writings by Dr Maqbool, the larger part of which is his letters to the editors of the English national dailies. One such letter is titled 'A letter from the dead: I cannot thank you enough for your editorial.'

"I belong to the long dead city of Lyallpur. The carcass was renamed Faisalabad, Lyall became Faisal and Pur turned Abad. You have lamented the slumber of the politicians and officers," read the letter.

"I am ashamed to admit that you will find champions of Maulvi Sarwar amongst the doctors, lawyers and professors, the so-called elite of Pakistani society-the best among the nations, you know. For the poor departed soul of Zille Huma Usman let Maulana Jalaluddin Rumi speak:

> My love is beautiful-one of her faults.
> Delicate... soft... that's two and three.
> But what's the reason people really shun her?
> She is perfectly faultless, that is the sin they flee.

After Zille Huma, Salmaan Taseer became the target and the nation so far could not take a principled stand. Munazza deserves all praise for preserving Maqbool's asset which will enlightens not the present generations but also the coming times.

By:

SHAFQAT TANVEER MIRZA

proletariat and disseminated the 'sweetness and light' of love through his works and deeds, as professed by him in one of his letters to his sister 'Za' (the writer / compiler's nickname). Verily his passing away has caused a palpable vacuum in our literary as well as cultural circles.

The second part of the book carries tributes to the departed soul from a cross section of relations, friends, contemporaries, professionals and literary personages. The list includes Asbah Asim (his talented little nice who was composed a poem for him in English), Ch. Tufail Muhammad borther of the noted left-wing political activist late Major ® Ishaq Muhammad (his maternal uncle), Nazir Ahmad Gill (cousin), Dr. Zarqa Aamir Aziz (his promising physician daughter), Dr. Ehsan-ul-Haq (eminent physician, intellectual and man of letters), Muhammad Idress (noted cricket commentator) and his wife Sabiha Idrees (close family friends), the writer of this column, Brig. Asif Haroon (relation), Khalid Mehmood Khan (reputed writer), Muhammad Khalid Masud Qureshi (friend), Dr. Asif Tauseef (friend / patient), Dr. Sultan Abdullah (friend), Dr. Fayyaz Mehmood (old college / hostel fellow), Dr. Mukhtar Ahmad (old class-mate), Dr. Waheed Ahmad (noted writer/poet), Dr. Yunus Ayaz (old colleague), Zaman Khan (well known political activist/analyst), Prof. Shamim Zafar Rana (educationist/writer), Allama Zia Hussain Zia (writer, poet and editor of Zar Nigar magazine), Arif Hussain Arif (litterateur), Umair Ghani (son of lafe Prof. Rana Irshad Ahmad Khan, a literary celecrity of yore), Capt ® Nisar Akbar Khan (prominent political figure), Mehboob Ali Shah (international cricket umpire), Mehmood Sana (veteran poet), Nosheen Haider (educationist/linguist), Naveeda Kausar (family friend) and Ahmad Shahbaz Khawar (popular writer/poet).

The book is a good read and hopefully, readers will like it for its content and style.

By:
SYED AFSAR SAJID

اُردو افسانے کا تنوّع یہ ہے کہ اس پر یک رنگی کی کیفیت کبھی بھی نہیں رہی۔ موضوع ہو، تکنیک یا اسلوب ہر دور میں اُردو افسانہ رنگا رنگ رویوں سے مزین رہا ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی اُردو افسانے کا یہ تنوّع برقرار رہا ہے اگر ایک طرف علامتی، نیم علامتی اور استعاراتی کہانی لکھی جا رہی ہے تو کچھ افسانہ نگار بیانیہ کے نئے اِمکانات بھی تلاش کر رہے ہیں۔ منزّہ سلیم ایسے ہی افسانہ نگاروں میں شامِل ہیں۔ جنھوں نے بیانیہ انداز کو برقرار رکھا لیکن روایتی بیانیہ کی بجائے ان کے یہاں اظہار کے نئے مگر سادہ انداز اُبھرے۔ ان کے موضوعات معاشرے کے عام موضوعات ہیں جن میں مجھے کئی برسوں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی صرف افسانہ نگاروں کے چیزوں کو دیکھنے کے رویے اپنے ہیں۔ اس پرانے معاشرے میں چیزوں کو نئے رویوں سے دیکھنا آگے کا ایک قدم ہے جو منزّہ سلیم کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ موضوعات کے حوالے سے ان کی کہانیاں ہمارے سماجی رویوں کی عکاس ہیں اور ان کے بیانیہ کی لطافت نے ان میں ایک اثر انگیزی اور دِل پذیری پیدا کر دی ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو پڑھانے کی خوبی رکھتا ہے۔ منزّہ سلیم کے افسانوں میں یہ خوبی موجود ہے، اور یہ ایک اہم بات ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد